نجد سے سہارن پور تک

مؤلف علامہ کامل سہسرامی



محمد رحمت اللہ صدیقی

رضا دار المطالعہ
پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار

نجد سے سہارنپور تک

حضرت علامہ محمد میاں کامل سہسرامی

علیہ الرحمۃ والرضوان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نجد سے سہارنپور تک

حضرت علامہ محمد میاں کامل سہسرامی

ناشر

رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار

کتاب : نجد سے سہارن پور تک

مصنف : علاّمہ کامل سہسرامی

اشاعت : دسمبر ۲۰۱۸

قیمت : 100

تعداد : 1100

صفحات : 120

ناشر : رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار

ملنے کے پتے

کتب خانہ امجدیہ 447، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔

دار العلوم خیریہ نظامیہ بارہ دری، سہسرام، 821115 بہار

دار العلوم غریب نواز، مرزا غالب روڈ، الہ آباد، یوپی۔

القلم فاؤنڈیشن، نزد الہ آباد بینک، پتھر کی مسجد، پٹنہ۔6

فہرست

صفحہ نمبر	مضامین

انتساب

مدیر پاسبان کی اس تحریک کے نام.....

جس نے میرے قلم کو نجد کے ریگستان میں

بگٹٹ دوڑنے پر مجبور کیا

کامل سہسرامی

محمد ملک الظفر سہسرامی

پیش لفظ

حضرت علامہ محمد میاں کامل سہسرامی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق جس مردم خیز خطے سے تھا، وہ ہر دور میں علم وفن اور شعور وآگہی کی خیرات تقسیم کرنے میں پیش پیش رہا۔ علمی، فکری اور سیاسی محاذ پر یہاں کے جانبازوں اور سپوتوں کی تاریخ سنہری حرفوں سے تحریر کیے جانے کے لائق ہے۔ پھر جس گھرانے میں انہوں نے آنکھیں کھولیں وہ گھرانہ بھی علم وفکر کا ایک مستقل اسکول تھا۔ آپ کے والد ماجد قدوۃ العلماء، زبدۃ الفضلاء حضرت علامہ الحاج الشاہ محمد فرخند علی نقشبندی مجددی علیہ الرحمۃ نہ صرف یہ کہ علومِ ظاہرہ کے ایک متبحر عالمِ دین اور وقت شناس فقیہہ تھے بلکہ بحرِ معرفت وطریقت کے ایک بڑے شناور بھی تھے۔ علومِ ظاہرہ وباطنہ کی تعلیم وتربیت رئیس الاولیاء، قطب زماں حضرت علامہ الحاج الشاہ محمد عبدالکافی الہ آبادی قدس سرہٗ کی بافیض درسگاہ میں ہوئی تھی۔ ایک ایسے ہی عالمِ جلیل اور فاضلِ نبیل کی آغوشِ تربیت میں آنکھیں کھولنے والی شخصیت تھی حضرت علامہ کامل سہسرامی کی۔ گھر کا پورا ماحول علمی تھا۔ گھر کیا تھا دین کی ایک بڑی درسگاہ اور اسلام کا ایک مکتب تھا۔ حضرت علامہ فرخند علی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رہائشی مکان کے ایک حصے کو تعلیم وتعلّم کے لیے مخصوص فرما دیا تھا۔ اور دار العلوم خیریہ نظامیہ میں تعلیم حاصل کرنے والے وہ طلبہ جن کا تعلق منتہی درجات سے ہوتا، ان کی علمی وفکری پیاس بجھانے کے لیے آپ کے مکان کا یہ مخصوص حصہ پنگھٹ بنا رہتا تھا۔ جس میں مقامی وبیرونی طلبہ کی دینی ومذہبی تعلیم کا نظم ونسق چلتا تھا۔

گو کہ حضرت علّامہ کامل سہسرامی علیہ الرحمۃ کو اپنے والد گرامی کی آغوشِ تربیت میں پروان چڑھنے کا موقع کم اور بہت کم میسر آیا۔ لیکن اس مختصر سی مدت میں بھی پلانے اور فیضان بانٹنے والی شخصیت نے باطن کی تطہیر اور آرائش کچھ اس انداز میں فرمادی کہ وقت کی تیز وتند ہواؤں سے ان کا کردار و عمل محفوظ رہا۔ شعور کی آنکھیں جب کھلی ہیں تو گردوپیش پر محرومی کا ایک مہیب سایہ مسلط ہے۔ ماحول پر یتیمی کی فضا قائم ہے، دور دور تک تاریکیوں کا ختم نہ ہونے والا ایک طویل سلسلہ ہے۔ لیکن ان تاریکیوں، اداسیوں اور غموں کے ہجوم میں ایک ابرِ لطف و کرم بھی، ایک سائبان رحمت بھی، شفقت و محبت کی پر کیف بادِ بہاری بھی۔ جو وقت کے تیز وتند جھونکوں سے اس تر و تازہ کلی کی شگفتگی قائم رکھنے اور پژمردگی سے محفوظ رکھنے کے عمل میں شبانہ روز مصروف ہے۔ اگر ایک طرف والدۂ محترمہ کا محبت بھرا آنچل ملا تو دوسری جانب فخر الاماثل، محدث سہسرامی حضرت علّامہ ضیاء الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسی علم و فضل والی شخصیت نے آپ کی علمی سرپرستی میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ حضرت علّامہ ضیاء الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگر ایک طرف حضرت علّامہ فرخند علی رحمۃ اللہ علیہ کے چہیتے اور دل عزیز شاگرد تھے تو دوسری جانب آپ کو ان سے شرفِ دامادی بھی حاصل تھا۔ ظاہر ہے کہ ان نازک رشتوں کے جو فطری اور طبعی تقاضے تھے انہوں نے حضرت علّامہ کامل سہسرامی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی و فکری شخصیت کو نکھارنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ لیکن رشتوں کی نزاکت کبھی کبھی اور کہیں کہیں حارج اور رکاوٹ بنتی نظر آنے لگی۔ چنانچہ آپ نے ترکِ وطن کا ارادہ کرلیا اور رختِ سفر باندھا مدرسہ سبحانیہ کے فیضانِ علمی سے سیراب ہونے کے لیے الہ آباد پہنچ گئے۔ اس زمانے میں مدرسہ سبحانیہ کا علمی مزاج و منہاج معیاری اور پُرکشش تھا۔ دیگر اساتذۂ کرام کے علاوہ شمس العلماء حضرت علّامہ مفتی نظام الدین صاحب بلیاوی ثم الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ سبحانیہ کی مسند تدریس کے شہہ نشین تھے، آپ نے ان کی علمی و فکری صلاحیتوں سے بالخصوص اکتسابِ فیض کیا۔ لیکن ھل من مزید کا جو نعرہ تھا اس کا جوش کم نہیں ہو رہا تھا اور پھر پتا کرتے کرتے مبارکپور ضلع اعظم گڑھ کی درسگاہ الجامعۃ الاشرفیہ کے بارے میں

معلومات فراہم ہوئیں تو پھر الہ آباد سے بھی رختِ سفر باندھنے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ آخرش مبارکپور کی اس عظیم درسگاہ میں پہنچے۔ اس زمانے میں الجامعۃ الاشرفیہ، الجامعۃ الاشرفیہ نہیں ہوا تھا بلکہ مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم کے نام سے اہلِ علم کے درمیان معروف تھا۔ اس دور میں حافظِ ملت حضرت علامہ عبدالعزیز صاحب اور شمس العلماء حضرت علامہ مفتی شمس الدین جونپوری رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ درسگاہ کی زیب وزینت کا سامان بنے ہوئے تھے۔ علامہ کامل سہرامی دیگر اساتذۂ کرام کے علاوہ بالخصوص ان دو مذکورہ شخصیات کی درسگاہوں میں علم وفن کی برسنے والی برکھا برسات میں خوب خوب فیضیاب ہوئے اور ان کی علمی وفکری تربیت کے نقوش بھی علامہ کامل سہرامی کی شخصیت میں نمایاں ہونے لگے۔ اسی اثنا میں طلبہ ومدرسین اور انتظامیہ کے مابین اختلاف کی چنگاری پھوٹ پڑی اور بہترین تعلیمی ماحول چشمِ بد کا شکار ہو گیا اور الجامعۃ الاشرفیہ بحرانی دور سے گزرنے لگا۔ تعلیمی ماحول پر پراگندگی چھانے لگی۔ اور اختلاف کی آگ نے اس کی علمی چمک دمک پر بٹہ لگانا شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی دارالعلوم شاہ عالم احمد آباد کی درسگاہ میں اپنی علمی رونقوں کے ساتھ چلے گئے۔ اس زمانے میں الجامعۃ الاشرفیہ میں جو طلبہ منتہی درجے کے تھے، وہ بھی علامہ اعظمی کے ساتھ دارالعلوم شاہ عالم چلے گئے۔ جانے والے ان طلبہ کے ایک فرد علامہ کامل سہرامی بھی تھے۔ اور پھر دارالعلوم شاہ عالم سے ہی درجۂ فضیلت کی تکمیل فرمائی اور سند ودستار سے نوازے گئے۔

حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ سے علامہ کامل سہرامی نے جہاں ایک طرف درسی کتابیں پڑھیں وہیں ان کے جوہرِ خطابت سے بھی وہ فیضیاب ہوئے۔ اس زمانے میں علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی اپنی انفرادی خطابت، دل پذیر وعظ اور اچھوتے طرزِ بیان کے سبب ہندوستان کے مقبولِ خواص وعوام شہرت یافتہ خطیب کی حیثیت سے پورے ملک میں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ چکے تھے۔ آپ کے اندر جو جوہرِ خطابت تھا اس کی اساس وبنیاد یقیناً حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی کی شخصیت تھی۔ تعلیمی فراغت کے بعد

گجرات کے ضلع بھڑوچ کے ایک علاقے انکلیشور میں وہ بحیثیت امام وخطیب اپنے علمی فیضان کی برکھا برسات برساتے رہے۔ یہ وہ دور تھا جس میں وہ نہ بحیثیت خطیب شہرت یافتہ تھے نہ ہی ان کا جوہرِ صحافت ابھر کر سامنے آیا تھا۔ لیکن ایک امام وخطیب کی حیثیت سے ان علاقوں میں انہیں جو مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل تھی اسے اس واقعے کی روشنی میں بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دار العلوم خیر یہ نظامیہ جو آپ کے بزرگوں کی علمی و دینی یادگار ہے۔ حضرت علامہ مفتی محمد صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس زمانے میں دار العلوم خیر یہ نظامیہ کے شعبۂ افتاء کی صدارت فرما رہے تھے تو دوسری طرف اس ادارے کے اہتمام وانتظام کی جملہ ذمہ داریاں بھی نبھا رہے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ نے اپنی حیات کا طویل سفر دار العلوم خیر یہ نظامیہ سہسرام کی تعمیر وترقی کے لیے وقف فرما دیا تھا۔ چونکہ آپ کو نہ صرف حضرت علامہ فرخند علی رحمۃ اللہ علیہ سے شاگردی و تلمذ کا شرف حاصل تھا بلکہ حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ حضرت علامہ فرخند علی رحمۃ اللہ علیہ کے چہیتے مرید وخلیفہ بھی تھے لہٰذا فطری طور پر حضرت مفتی صاحب ان دو اہم رشتوں کے تقاضوں کے تحت دار العلوم خیر یہ نظامیہ کی آبیاری میں تن من سے لگے تو لگے رہ گئے۔ حضرت علامہ کامل سہسرامی کی تعلیمی فراغت اور پھر میدانِ عمل کے تجربوں سے گزرنے کے بعد دار العلوم خیر یہ نظامیہ کے اربابِ حل وعقد نے آپ کی ضرورت محسوس کی۔ ایک جوان کاندھے کی حاجت کا احساس شدت کے ساتھ کیا گیا جو حضرت مفتی صدیق صاحب علیہ الرحمۃ کے کمزور ہوتے ہوئے بازوؤں کو سہارا دے سکے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مخلصینِ مدرسہ کے مشورے سے حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ نے حضرت کامل سہسرامی سے اس سلسلے میں بذریعہ خط وکتابت رابطہ کیا تو ان کے لیے یہ فیصلہ امتحان وآزمائش کا سبب بن گیا۔ اگر ایک طرف ان کے اسلاف اور بزرگوں کی علمی یادگار دار العلوم خیر یہ نظامیہ کا تقاضہ ہے تو دوسری جانب ضلع بھڑوچ کے اس علاقے کے عقیدت مند سنّی مسلمانوں کی نیازمندیوں کی پکار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ کامل سہسرامی وہاں لوگوں سے صاف صاف انداز میں یہ کہہ

کرآتے کہ اب میں تم لوگوں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہورہا ہوں تو کوئی بعید نہیں کہ لوگ آپس میں دست بگریباں ہوجاتے۔ آخرش اپنے اسباب و متاع وہیں چھوڑ کر بغیر اطلاع سہسرام آئے اور پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ سہسرام تو آپ کا وطن مالوف ہی ٹھہرا۔ یہاں کی مٹّی سے آپ کے بچپن کی کتنی یادیں وابستہ تھیں اور پھر سب سے بڑھ کر ان کے اسلاف کی علمی یادگار دارالعلوم خیریہ نظامیہ، جس کی تعمیر و ترقی کے لیے آپ کی تربیت ہوئی تھی۔ چنانچہ اب وقت آگیا تھا کہ علامہ کامل اپنی خداداد علمی وفکری صلاحیتوں سے دارالعلوم خیریہ نظامیہ کی کلاہِ افتخار میں چار چاند لگادیں۔ پھر ہوا بھی ایسا ہی۔ آپ نے بحیثیت نائب مہتمم دارالعلوم خیریہ نظامیہ کی تعمیر و ترقی میں حضرت مفتی محمد صدیق صاحب علیہ الرحمۃ کے ناتواں بازوؤں کو قوت و توانائی دے کر ایک تاریخ ساز کردار ادا فرمادیا۔

جس زمانے میں آپ گجرات کے علاقے میں بحیثیت امام وخطیب اشاعتِ دین و تبلیغ اسلام میں مصروف تھے۔ انہی ایام میں حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے الہ آباد سے مسلکِ اعلیٰ حضرت کی نقابت و ترجمانی کے لیے ایک آرگن ماہنامہ ''پاسبان'' کے نام سے جاری فرمایا۔ چنانچہ علامہ کامل سہسرامی رحمۃ اللہ علیہ ''پاسبان'' کے رفقائے قلم میں شامل ہوگئے اور پھر رفتہ رفتہ آپ کا جوہرِ قلم نمایاں ہوکر سامنے آنے لگا۔ جس زمانے میں الہ آباد کی معروف دینی درسگاہ مدرسہ سبحانیہ میں آپ دینیات کا درس لے رہے تھے، اسی زمانے میں حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی بھی درسیات کی تکمیل فرمارہے تھے۔ لیکن دونوں میں فرق یہ تھا کہ حضرت علامہ نظامی سینئر طالب علم تھے اور حضرت علامہ کامل سہسرامی جونیئر۔ چونکہ دونوں ایک ہی علمی پنگھٹ سے ایک ساتھ اپنی پیاس بجھارہے تھے، ظاہر ہے کہ دونوں کے درمیان اس نسبت کے حوالے سے فطری تعلق قائم ہونا تھا۔ دونوں کے درمیان نہ صرف تعلیمی درجات کا بہت زیادہ فرق تھا بلکہ ان کی عمر میں بھی بہت زیادہ تفاوت تھا۔ علامہ کامل سہسرامی نے اپنے علمی وفکری سفر کا آغاز علامہ نظامی کے بہت بعد کیا۔ گجرات کے علاقوں میں علامہ نظامی جب خطابت کے لیے تشریف لے جاتے تو وہ ان

جلسوں اور کانفرنسوں میں ابتدائی مقرر کی حیثیت سے خطاب فرماتے۔ اس تعلق سے علامہ نظامی تحریر فرماتے ہیں: ''اس وقت گجرات کا مہینوں دورہ کرتا اور کامل بھڑوچ، انکلیشور وغیرہ کے پروگراموں میں میرے ساتھ رہتے۔ حتیٰ کہ اب وہ مجھ سے اتنے قریب ہو گئے کہ وہ ابتدائی مقرر کی حیثیت سے میرے جلسوں میں تقریر کرتے مگر ان کا اندازِ تقریر دیکھ کر یہ کہاوت یاد آجاتی ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات''

لیکن بعد میں انہوں نے اپنی خداداد علمی صلاحیتوں کا مظاہرہ فرمایا تو پھر یہ تمیز مشکل ہو گئی کہ ان دونوں میں سینئر کون ہے اور جونیئر کون۔ اس حوالے سے شمس العلما حضرت علامہ مفتی نظام الدین الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ جنہیں بیک وقت دونوں نونہالوں کی تعلیم و تربیت فرمانے کا موقع ملا وہ رقم طراز ہیں: ''جب میں یوپی کے مشہور ادارے مدرسہ سبحانیہ میں تعلیم دے رہا تھا تو دو نونہال میرے سپرد کیے گئے۔ ایک کا نام مشتاق نظامی اور دوسرے کا نام کامل سہسرامی تھا۔ یہ دونوں شکل و صورت میں عام انسانوں کی طرح ضرور تھے مگر اپنے اندر کچھ امتیازی شان رکھتے تھے۔ یہ خاموش تھے مگر اس حالت میں ناطق و گویا بھی تھے۔ ابتدا میں چونکہ مولانا کامل کھیل کود کے شوقین تھے اس لیے ان کے ابھرنے میں کچھ تاخیر ہوئی۔ مولانا مشتاق چونکہ میری تعلیم کے ساتھ ساتھ حضرت مجاہد ملت کی تربیت کے شکنجے میں دبے ہوئے تھے اس لیے ان کی وہ قوت نہ ابھر سکی۔ لیکن جب مولانا کامل نے ہوش سنبھالا تو ان دونوں میں یہ امتیاز کرنا کہ ان میں پیش رو کون ہے اور پس رو کون مشکل ہو گیا۔ (سہ ماہی الکوثر، شمارہ اپریل تا جون ۱۹۹۷ء ص: ۳۲)

علامہ مشتاق احمد نظامی اور علامہ کامل سہسرامی کے درمیان تعلقات کی جو گہرائی تھی وہ ناقابلِ بیان ہے تاہم دونوں کے مابین تکلف کی ایک دیوار حائل تھی۔ وہ ہمیشہ علامہ نظامی کا احترام ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے کرتے۔ دونوں کے مزاج میں بھی حد درجہ یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ دونوں ایک ہی راہ کے مسافر تھے۔ تحفظ ناموسِ رسالت دونوں کا مشن تھا۔ میدانِ عمل میں دونوں کی زبانیں اور دونوں کے قلم اشاعت دین اور تحفظ عظمت

نبوت میں یکساں چل رہے تھے اور دونوں کی مکمل زندگی مسلک اعلیٰ حضرت کی نقابت و ترجمانی میں گزر گئی۔ (علامہ مشتاق احمد نظامی اور علامہ کامل سہسرامی کے مابین تعلقات ایک مستقل عنوان ہے۔ جس پر ایک مستقل مضمون تحریر کیا جاسکتا ہے۔)

دار العلوم خیریہ نظامیہ سہسرام میں بحیثیت نائب مہتمم ذمہ داری قبول فرمانے کے بعد آپ کا جوہرِ خطابت بھی دھیرے دھیرے نمایاں ہونے لگا۔ اب آپ کی قلمی لیاقتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ خطابت کی دھوم بھی پورے ملک میں مچ گئی اور بہت جلد اہلِ سنّت و جماعت کی صفِ اوّل کے خطبا میں آپ کا شمار ہونے لگا۔ آپ نے نہ صرف اپنے قلم سے بلکہ خطابت کے ذریعے بھی اعلیٰ حضرت سیّدی امام احمد رضا فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار و نظریات کی کھل کر اشاعت فرمائی۔ نظامت، خطابت اور صحافت کی بے پناہ ملی مصروفیات میں گھری زندگی کا نتیجہ یہ ہوا وہ مختلف امراض کے شکار ہو گئے جن میں السر اور عارضۂ قلب زیادہ پریشان کن تھے انہی دنوں حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی رحمۃ اللہ علیہ نے ہفت روزہ تاجدار جاری فرمایا۔ جس کا صدر دفتر ممبئی تھا اور ذیلی دفتر الٰہ آباد۔ حضرت علامہ کامل سہسرامی نے ہفت روزہ تاجدار کی صحافتی ذمہ داری نبھائی اور بہت خوب نبھائی۔ ان ایام کے تعلق سے حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی ان کے وصال پر اپنے تاثراتی مضمون میں رقم طراز ہیں:

''کامل رات دن ایک کر کے ہفت روزہ تاجدار کی سطروں میں الفاظ کے موتی پروتے۔ اس دور میں کئی کئی کاتب بیٹھے رہتے، لکھتے لکھتے کاتب تھک جاتے، مگر کامل کا رواں دواں قلم نہ رکتا۔ تاجدار ہی کے دور میں میں نے ان کی صلاحیتوں کو جانچا پرکھا۔ وہ آرام پسند ضرور تھے مگر جب کام آجاتا تو ایک مجاہد اور مزدور کا روپ دھار لیتے۔ اگر مدرسہ خیریہ ان کی علمی یادگار ہے تو تاجدار کا فائل ان کے قلم کا شاہکار۔

تاجدار ایک ایسا آئینہ ہے جس میں کامل کی بے غبار تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کے بے شمار نقوش تاجدار کے صفحات پر ابھرے اور بکھرے ہوئے ہیں۔''

ہفت روزہ تاجدار کی اشاعت کے زمانے میں دفتر تاجدار میں ایک صاحب تشریف

لاتے تھے جنہیں لوگ علّامہ کاجل کے نام سے جانتے پہچانتے تھے۔ ان کے بارے میں لوگوں کو زیادہ معلومات تو نہ تھیں تاہم لوگ اتنا جانتے تھے کہ یہ ایک علم دوست شخص ہیں اور پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان وقت گزارنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ لوگوں کو ان کا جغرافیائی پس منظر بھی نہ معلوم تھا۔ ہفت روزہ تاجدار کی اشاعت کے زمانے میں علّامہ کامل سہسرامی کا باقاعدہ قیام الہ آباد میں رہتا، وہ ہفتے میں تین دن الہ آباد میں گزارتے، ان دنوں الہ آباد ان کا وطنِ ثانی ہوگیا تھا۔ الہ آباد قیام کے دوران وہ تاجدار کے صفحات کے لیے اپنا خونِ جگر کشید کرتے اور اس کے صفحات کو رنگ وروغن فراہم فرماتے، وہ لکھتے اور بے تکان لکھتے۔ اسی زمانے میں سرکار مجاہد ملّت حضرت علّامہ الحاج الشاہ محمد حبیب الرحمان رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک حادثہ ہوا۔ حضرت بنارس میں تھے اور وہاں فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک اٹھی، شر پسندوں نے سرکار مجاہد ملّت کو اپنی فرقہ واریت کا نشانہ بنایا اور وہ بے پناہ زدوکوب کا شکار ہوئے۔ اپنی دانست میں انہیں مردہ سمجھ کر پھینک دیا۔ لیکن سرکار مجاہد ملّت زندہ تھے، زخموں سے چور چور کسی طرح وہ الہ آباد پہنچ گئے۔ الہ آباد کو آپ کے وطنِ ثانی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ الہ آباد پہنچنا تھا کہ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور سرکار مجاہد ملّت کے عقیدت مندوں، نیازمندوں میں ایک کہرام برپا ہوگیا۔ آپ کی حالت دیکھ کر سب کا کلیجہ کانپ گیا۔ تفصیلات کی جانکاری کے بعد علّامہ کامل سہسرامی نے ہفت روزہ تاجدار میں اس مذموم حرکت کے خلاف سخت اور بے باک لب ولہجے میں اپنے دردوکرب کا اظہار فرماتے ہوئے حکومتِ وقت کو آڑے ہاتھوں لیا اور سراپا احتجاج بن کر نمایاں ہوئے۔ اس خبر کے لیے انہوں نے جو ذیلی سرخی قائم فرمائی اس سے ان کی جرأت وبے باکی کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ سرخی یہ تھی: ''سرکار مجاہد ملّت پر حملے ہوتے رہے اور پولس نکمی تماشائی بنی دیکھتی رہی۔'' خبر کاتب کے حوالے کردی گئی۔ کاتب کتابت میں مشغول تھے کہ اسی درمیان علّامہ کاجل دفتر ہفت روزہ تاجدار تشریف لائے اور حسبِ عادت اِدھر اُدھر جائزہ لینے کے بعد کاتب کو اس خبر کی کتابت کرتے دیکھا تو وہ اسی طرف متوجہ ہوئے اور اس خبر کی سرخی پر

اعتراض کیا۔علّامہ کاجل علامہ کامل سہسرامی کے پاس پہنچے اور سرخی پر اعتراض کرتے ہوئے اپنا نظریہ ظاہر کیا اور اس سرخی کو حکومتِ وقت پر براہِ راست تنقید سے تعبیر کرتے ہوئے سرخی بدل دینے کی درخواست کی۔لیکن آپ سرخی تبدیل کرنے کے لیے کسی طرح بھی راضی نہ تھے۔سرکار مجاہد ملّت کی حالت دیکھنے کے بعد ان کے صبر وضبط کا سارا بند ٹوٹ گیا۔علّامہ کاجل نے ہزار جتن کیے، بہت سمجھایا، قانونی نزاکتوں کا بھی احساس دلایا، سرخی کا تیور کچھ ہلکا کر دینے کی درخواست کی لیکن وہ اپنی ضد پر جواڑے تو علّامہ کاجل کے افہام وتفہیم کی ہر کوشش رائیگاں اور بے سود ثابت ہوئی۔دراصل علّامہ کاجل سی بی آئی کے خفیہ نمائندہ تھے جس کی جانکاری کسی کو نہ تھی۔ظاہر ہے کہ وہ کھل کر تو کہہ نہیں سکتے تھے لہٰذا حکمت وتدبیر کے ذریعے روکنے کی جتنی کوششیں تھیں ان سے وہ باز نہ آئے۔چنانچہ اخبار ترتیب وتزئین کے مرحلے سے گزر کر پریس میں طباعت کے لیے گیا اور پھر جوں ہی ہفت روزہ تاجدار کی مذکورہ کاپی دفتر میں آئی کہ سی بی آئی نے ہفت روزہ تاجدار کا آفس سیل کر کے تمام کاپیاں ضبط کر لیں۔پرنٹر، پبلشر کی حیثیت سے مولانا انوار احمد نظامی رحمۃ اللہ علیہ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔

آپ کی حیات میں ایک دور ایسا بھی گزرا کہ جس میں انہوں نے خطابت کی بے پناہ مصروفیات کے باعث قرطاس وقلم سے کچھ اس طرح رشتہ ناطہ توڑ لیا جیسے کبھی انہیں اس میدان سے تعلق ہی نہ رہا ہو۔جس کے قلم کی سیاہی خشک نہ ہوتی، جو بے تکان لکھتا، جس کا قلم بے حد سیال تھا۔ایسا قلمکار کچھ اس انداز سے خاموش ہوا کہ قلمی دنیا میں ایک عرصے تک اس کا نام تک نظر نہیں آتا تھا۔لیکن جمود وتعطل کی اس کالی رات سے سپیدۂ سحر اس وقت نمودار ہوا جب حضرت علّامہ مشتاق احمد نظامی ماہنامہ پاسبان کی نشاۃِ ثانیہ کا عزمِ مصمم لے کر میدانِ عمل میں اترے۔آپ علّامہ نظامی کے لیے ایک مضبوط قوتِ بازو تھے۔اس تعلق سے ان کی تحریر ملاحظہ کریں:"اب زندگی کے نئے موڑ پر کامل میری قوتِ بازو تھے۔تاجدار سے پاسبان تک، پاسبان سے مکتبہ، مکتبہ سے دار العلوم غریب نواز تک۔اگر یہ تمناؤں اور

آرزوؤں کا کوئی ڈھانچہ ہے تو کامل اس کی روح تھے"۔

جماعتی، مسلکی، اشاعت دین اور تبلیغ اسلام کے حوالے سے دونوں کے مزاج ومنھاج میں حد درجہ مشابہت ومماثلت پائی جاتی تھی۔ دونوں کی تحریروں میں بھی آپ کو حد درجہ یکسانیت نظر آئے گی۔ علامہ مشتاق احمد نظامی نے ماہنامہ پاسبان کی دوبارہ اشاعت کا جو خاکہ تیار کیا، علامہ کامل سہرامی یقیناً اس کی روح تھے۔ چنانچہ پاسبان کے لیے ان کی بے پناہ مصروفیات سے کچھ حصہ پاسبان کے لیے طلب کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ علامہ نظامی کی بات وہ کس طرح ٹال سکتے تھے۔ ماہنامہ پاسبان سے آپ کا جو قلمی رشتہ استوار ہوا تو وہ تادمِ حیات قائم رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے بعد انہیں حیات نے کوئی طویل موقع نہیں دیا۔ اس دور میں پھر انہوں نے ماضی کی تابناک یادیں تازہ کردیں، قلمی خدمات کا نہ رکنے والا وہ خوشگوار سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا۔ آپ کا قلم کہیں زہر اگلتا تو کہیں گلہائے عقیدت نچھاور کرتا۔ وقت کا کارواں گزرتا رہا اور قلم کا یہ شہنشاہ اپنی بے پناہ خداداد قلمی صلاحیتوں کی بنیاد پر قارئین اہل سنّت سے خراجِ تحسین وصول کرتا رہا۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ خدا اعتمادی اور خود اعتمادی کی دولتِ لازوال سے مالا مال تھے۔

حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ پاسبان نے سراج الامت حضرت امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی، علمی وفکری خدمات پر ماہنامہ پاسبان کے ایک ضخیم اور مبسوط نمبر کا اعلان فرمایا۔ اس تعلق سے علامہ کامل سہرامی نے مدیرِ پاسبان حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی کے نام ایک مکتوب تحریر فرمایا جس میں انہوں نے اس نمبر کے حوالے سے دوٹوک اور واضح انداز میں اپنا نظریہ اور عندیہ ظاہر فرمادیا۔ آپ فرماتے ہیں:

"برادرم مخدوم! السلام علیکم

تاریخ کی تبدیلی محض آپ کی خاطر کررہا ہوں۔ اب ۴/۵/۶ رمئی جلسہ کی تاریخ رکھ دی ہے۔ اخیر کی دو تاریخوں میں آپ کی شرکت لازمی ہے۔ ایک دن کے لیے آنا ہو تو نہ آیئے گا۔ منظوری کا جواب بہت واضح اور غیر مبہم عنایت کیجیے۔ اب دیگر حضرات سے آپ

کے جواب کے بعد رابطہ قائم کروں گا اس لیے جلد جواب عنایت فرمائیں۔آج ہی ممبئی کے پتے پر بھی ایک لفافہ لکھ چکا ہوں۔

آج ٹیکم گڑھ جاتے ہوئے الہ آباد ٹھہرا۔اپریل کے شمارے میں امامِ اعظم نمبر کا اعلان آرہا ہے۔اس نمبر کے لیے جو عنوانات میری سمجھ میں آئے، پیشِ خدمت ہیں۔باقی حذف و اضافہ آپ کرلیں۔جن سے جس عنوان پر مضمون مطلوب ہو انہیں عنوان کے ساتھ آپ اپنی طرف سے لکھ دیں۔لیکن جن لوگوں کے متعلق یقین ہو انہی کو لکھیں باقی اس ہیچ مداں کے لیے چھوڑ دیں۔کوشش کروں گا کہ کوئی عنوان چھوٹنے نہ پائے۔اپنے موضوع سے الگ ہو کر کوئی مضمون نمبر میں شائع نہ ہوگا۔ورنہ نمبر چوں چوں کا مربہ ہو جائے گا۔

اگر پاسبان کو ٹھیک ٹھکانے کا معیاری رسالہ بنانا ہے تو اس بات کی چھوٹ عنایت کیجیے کہ ہم دونوں جو مناسب سمجھیں گے شائع کریں گے۔سب کو خوش رکھنے کے التزام میں آپ کی خواہش کا احترام اگر ضروری ہو گیا تو رسالہ اعلانات و اخبارات کا مجموعہ ہو جائے گا۔اس مرتبہ چالیس صفحات میں چار صفحے اعلانات کی نذر ہیں۔جو یقیناً پڑھنے والوں پر بوجھ ہوگا۔اس سلسلے میں آپ کی رائے، خیالات اور تفصیلی جواب کے لیے شدت سے منتظر رہوں گا۔

گھر سب خیریت ہے۔کامل سہسرامی

لیکن افسوس! ان کی عمر نے وفا نہ کی اور ماہنامہ ''پاسبان'' کا مذکورہ نمبر ترتیب و تکمیل کی راہ تکتا رہ گیا۔آپ کا درج بالا مکتوب جہاں دونوں کے درمیان تعلقات و روابط کی گہرائیوں کی شہادت پیش کر رہا ہے وہیں اس کی ایک ایک سطر علامہ کامل کے صحافتی تجربے کی قسم کھا رہی ہے۔کس قدر خود اعتمادی کے وصف سے متصف تھے۔''جن لوگوں کے متعلق یقین ہو انہی کو لکھیں، باقی اس ہیچ مداں کے لیے چھوڑ دیں۔''

فرصت ملی تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیا؟

جن ایام میں وہ قرطاس وقلم سے اپنے قدیم رشتوں کی تجدید فرمار ہے تھے انہی دنوں

اہلِ سنّت وجماعت کا موقر جریدہ ماہنامہ استقامت ڈائجسٹ جو ہندوپاک میں اپنی فتوحات کے پرچم لہرا رہا تھا، اس کے مدیرِ اعلیٰ محترم حافظ ظہیر الدین قادری برکاتی نے ضخیم ''حج نمبر'' کی اشاعت کا ارادہ فرمایا تو اس کے لیے علاّمہ کامل سہسرامی سے نہ صرف یہ کہ قلمی تعاون کی خواہش ظاہر کی گئی بلکہ ماہنامہ استقامت ڈائجسٹ کی ترتیب وتہذیب کے لیے مستقل مجلسِ ادارت میں آپ کی شمولیت کی درخواست پیش کی گئی۔ چونکہ آپ کا مزاج اب رفتہ رفتہ لکھنے پڑھنے کی جانب مائل ہو رہا تھا۔ رہائشی مکان کے بالائی حصے کا ایک کمرہ اب دھیرے دھیرے ان کے لیے لائبریری کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا لہٰذا مدیرِ استقامت حافظ ظہیر الدین برکاتی کی یہ پیش کش وہ مسترد نہ کر سکے اور پھر ماہنامہ استقامت ڈائجسٹ کی مجلسِ ادارت میں مدیر ومشیر کی حیثیت سے اس کی ترتیب وتہذیب کے لیے مستقل وقت دینے کی درخواست قبول فرمالی۔ اس طرح ماہنامہ استقامت کی مقبولیت کا گراف مزید تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ ماہنامہ استقامت ڈائجسٹ کے ''حج نمبر'' کی شاندار کامیابی کا سہرا بہت حد تک علاّمہ کامل سہسرامی کے سر بندھتا ہے۔

''استقامت'' کے تاریخی ''حج نمبر'' میں ادارۂ استقامت میں آپ کی شمولیت کا باضابطہ اعلان بھی کیا گیا۔ جس کی سرخی یہ تھی: ''ادارۂ استقامت میں حضرت مولانا کامل سہسرامی کی شمولیت'' اس کے تحت مدیرِ اعلیٰ کی جانب سے یہ اعلان دیا گیا۔

''ملک کے نامور صحافی، مشہور صاحبِ قلم اور شہرہ آفاق خطیب ومقرر حضرت مولانا الحاج کامل سہسرامی نے میری مسلسل خواہشوں کے احترام میں ادارۂ استقامت میں شمولیت اور ترتیب وتزئین کی اہم ترین ذمہ داری قبول فرمالی ہے۔ یقین ہے کہ مولانا کامل کی شمولیت کے بعد استقامت کا معیار اور بلند، اس کی ترتیب اور زیادہ معیاری ہو جائے گی اور استقامت اپنے حلقۂ محبت میں اور زیادہ قدر ومنزلت کا حامل بن جائے گا۔ ظہیر الدین قادری

توقع کے مطابق ''حج نمبر'' کی مقبولیت نے روایت شکن فتوحات کے پرچم لہرا دیے، ہر طرف سے تحسین ومرحبا کی صدائیں بلند ہوئیں اور اسے تاریخی قبولِ عام حاصل ہوا۔ فوراً

تمام کا پیاں چھو ہوگئیں۔ ایک طرف ماہنامہ ''پاسبان'' الٰہ آباد کی ادارت، دوسری جانب ماہنامہ ''استقامت'' کی ذمہ داری، پھر اس پر ''دار العلوم خیریہ نظامیہ'' سہسرام کی نظامت اور اس پر مستزاد خطابت کے لیے طویل اور مسلسل اسفار، لیکن ڈھلتی ہوئی عمر میں اس مردِ مجاہد کو کبھی تھکا ہارا نہیں دیکھا گیا۔ بیماری کے مرحلے سے گزرتے ہوئے ڈاکٹروں نے سختی کے ساتھ دو چیزوں سے روکا تھا جن میں ایک ان کی مسلسل خطابت تھی۔ ڈاکٹروں کے اس حکیمانہ مشورے پر ان کا جواب یہی ہوتا تھا کہ تبلیغ، اشاعتِ دین اور مسلکِ اعلیٰ حضرت کی نقابت و ترجمانی میرے ضمیر کی آواز ہے۔ جو زندگی اور حیات کی روح ہے۔ زندگی میں یہ رشتۂ محبت تو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اگر قدرت نے میرے لیے موت اسی بہانے لکھ دی ہے تو اس سے بڑی کامل کی معراج نہیں ہو سکتی اور بقول مرزا غالب دہلوی ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اور پھر نوشتۂ تقدیر جو سامنے آیا تو خوش بختیوں والی موت کو آپ لبیک و سعدیک کہتے نظر آئے۔ مغربی بنگال کی راجدھانی کولکاتہ کی تاریخی ''جمالِ طیبہ کانفرنس'' کے اسٹیج سے شہادت کے عنوان پر اپنی شعلہ بار اور برق بار خطابت کے ذریعے قوم سے خطاب اور مسلک کی نقابت و ترجمانی کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمالیا ؎

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے ناز پہ
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

حضرت علامہ کامل سہسرامی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا جائزہ لینے کے بعد علامہ نظامی علیہ الرحمۃ کی اس بات سے اتفاق کرنا ہوگا کہ انہوں نے خطابت و صحافت کا استعمال بطور فن نہیں بطور مشن فرمایا۔ وہ جہاں بھی گئے مسلکِ اعلیٰ حضرت کے نقیب و ترجمان بن کر گئے۔ وہ تاحیات دین و ملت کی ترجمانی و نقابت میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف فرماتے رہے۔

آپ کے عم زاد کے خلفِ اصغر جناب زبیر احمد ایوبی نے راقم الحروف سے بیان کیا کہ

مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ان سے راستے میں میری آخری ملاقات ہوئی تھی۔ فرمانے لگے بیٹا زبیر! طبیعت صحیح نہیں ہے اور کلکتہ کے تقریری پروگرام پر بھی جانا ہے۔ وہ عرض گزار ہوئے کہ جب طبیعت صحیح نہیں ہے تو پروگرام ملتوی کردیجیے۔ جواباً فرمایا کہ نہیں، جانا تو پڑے گا۔ وعدہ کرچکا ہوں اور پھر تقریر و خطابت تو میرا مشن ہے۔ کسی دن تقریر کرتے کرتے ہی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرجائے تو یہ میرے لیے بے پناہ سعادت کی بات ہوگی۔

علامہ کامل سہسرامی رحمۃ اللہ علیہ جماعت کے گنے چنے ان چند اربابِ فضل وکمال میں تھے، جنہیں قدرت نے زبان وقلم پر یکساں قدرت عطا فرمائی تھی۔ وہ اگر خطابت کے شہسوار تھے تو میدانِ صحافت کے تاجدار بھی، ان کی برق بار اور شعلہ زباں خطابت سے باطل کے ایوان لرزہ براندام تھے۔ تو وہیں ان کے قلم کی روشنائی سے افکارِ فاسدہ وعقائدِ باطلہ کے چہرے پر ہزیمت ورسوائی کے خطوط روشن تھے۔ وہ بے تکان بولتے بھی تھے اور لکھتے بھی تھے۔ جب وقت آجاتا تو ایک مزدور کا روپ دھار لیتے۔ علامہ مشتاق احمد نظامی علیہ الرحمۃ آپ کی ان خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

''میرا کامل قلم ہی کا تاجدار نہ تھا بلکہ اپنے معاصرین میں فنِ خطابت کا ایسا پیش رو امام المقررین تھا، جس کی گردِ راہ نے اوجِ ثریا کو منزلوں پیچھے کردیا۔ کامل جس وقت صدری یا شیروانی کی سج دھج سے جھومتے جھامتے، ہنستے مسکراتے اسٹیج پر قدم رکھتے تو عوام میں ہلچل مچ جاتی، سرگوشیاں ہوتیں وہ دیکھو کامل میاں آئے اور جس وقت وہ خطابت کی کرسی پر بیٹھ کر الفاظ کی چاند ماری اور گولہ باری کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ ہم کسی کانفرنس میں نہیں بلکہ رزمگاہ میں بیٹھے ہیں جہاں چاروں طرف سے توپیں انگارہ اگل رہی ہیں اور گولوں کی برسات ہورہی ہے۔ کامل اپنی گرجدار آواز میں شوکتِ الفاظ سے جب قوم کو خطاب کرتے تو بادلوں کے گرجنے اور بجلیوں کے تڑتڑانے کا یقین ہوتا۔ کامل کشورِ قلم کا پاسبان وتاجدار اور میدانِ خطابت کا ابھرتا شہسوار تھا۔''

علامہ کامل سہسرامی رحمۃ اللہ علیہ کے زورِ قلم سے باطل کا ایوان لرزہ براندام تھا۔ ''نجد سے سہارن پور تک'' کی دھمک آج بھی محسوس کی جاتی ہے۔ ہفت روزہ ''تاجدار'' میں ان کے بے باک صحافتی مزاج ومنھاج کے جو روشن وتابناک نقوش تھے وہ ان کے صحافتی شعور وسیاسی مزاج ومنہاج متعین کرنے میں سنگِ میل ثابت ہو سکتے تھے۔ لیکن حیف! صد حیف ہزار کوششوں کے باوصف ہفت روزہ ''تاجدار'' کی کاپیاں مجھے نصیب نہ ہوسکیں۔

ہماری جماعت کے لیے کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہم منصوبہ بند انداز میں کام نہیں کرتے اور یہ اس کی کھلی نشانی ہے کہ آج ہماری تحقیقی نگاہیں ہفت روزہ ''تاجدار'' کی کاپیاں تلاش کر رہی ہیں اور وہ ہمیں دستیاب نہیں ہو پاتیں۔ جستجو آبلہ پا ہیں لیکن نتائج صفر محض۔ اس سے بڑی قیامت کیا ہوگی کہ دفتر ''تاجدار'' میں ''تاجدار'' کا فائل نہیں۔ دفتر ''پاسبان'' میں ''پاسبان'' کا فائل معدوم، دفتر ''استقامت'' میں ''استقامت'' کے شمارے نہیں ملتے۔ اس سلسلے میں ہم نے ملک کی بڑی، اہم اور معروف لائبریریوں کی خاک بھی چھانی مثلاً خدا بخش لائبریری پٹنہ، نیشنل لائبریری کولکاتہ، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، رضا لائبریری رامپور لیکن یہاں بھی ہماری کاوشوں کو ناکامیوں کا منھ دیکھنا پڑا۔ ہم نے اس نازک پہلو پر کبھی غور نہیں کیا کہ جو رسائل وجرائد نکل رہے ہیں ان کی حفاظت کی ضمانت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان لائبریریوں میں اگر ہر شمارے کی ایک کاپی پابندی کے ساتھ بھیج دی جاتی تو آج تحقیق کی راہوں میں ہماری آبلہ پائی کو ناکامیوں کا منھ دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ لیکن ہم نے اس سمت میں سنجیدگی سے سوچا نہیں، ہم نے تو یہ خیال کیا کہ مفت میں ان لائبریریوں کو ایک کاپی ہم کیوں روانہ کریں۔

ہفت روزہ ''تاجدار'' میں طنز ومزاح کا بھی ایک کالم ہوتا تھا جو نشیمن بنگلور کے ایک کالم ''مسجد سے میخانے تک'' کا جواب ہوتا تھا۔ ماہنامہ ''پاسبان'' کی نشاۃ ثانیہ جب عمل میں آئی تو اس میں خلافِ توقع ''نجد سے سہارن پور تک'' کا مزاحیہ کالم نہ تھا جب کہ علامہ کامل سہسرامی کے ہاتھوں میں ہی اس کی مکمل باگ ڈور تھی۔ تاہم مدیر استقامت حافظ ظہیر الدین

قادری برکاتی کی خواہشوں کے احترام میں انہوں نے طنز و مزاح پر مشتمل ایک مستقل مضمون ''چل میرے خامے'' کے عنوان سے تحریر فرمانے کا وعدہ کرلیا۔ جس کی تین یا چار قسطیں ماہنامہ ''استقامت'' ڈائجسٹ کانپور میں تسلسل کے ساتھ شائع ہوئیں۔ آپ نے اس مرتبہ اس کالم کے تحت جو مضمون دیا اس میں قلمکار کی حیثیت سے اپنا نام نہ دے کر ایک فرضی مزاحیہ نام ''ہمزاد اجتماعی'' منتخب فرمایا۔ چنانچہ اس کالم کے تحت جب پہلا مضمون ماہنامہ ''استقامت'' ڈائجسٹ میں شائع ہوا تو مدیرِ اعلیٰ حافظ ظہیر الدین قادری نے ماہنامہ ''استقامت'' ڈائجسٹ کی ایک اور کامیاب کوشش پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے اعلان فرما دیا۔ جس کا مضمون یوں تھا۔

''استقامت نے منتشر لوگوں کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ان کی دکھتی رگوں اور بیماریوں کی تشخیص کرلی ہے۔ اور انہیں بروقت ایک ایسی دوا تجویز کردی ہے جس سے غم ہلکے ہو جاتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے گرد و پیش کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے۔

استقامت ایک لذت ہے، ایک چٹخارہ ہے کسی کو یہ چٹخارہ سچی اور تاریخی کہانیوں میں ملتا ہے۔ کسی کو پُراسرار داستانوں میں، کسی کو دینی و علمی تخلیقات میں، کسی کو اردو ادب کے انتخابات میں یہی وجہ ہے کہ بہت مختصر مدت میں استقامت ملک کا ممتاز رسالہ بن گیا اور اس نے اردو صحافت میں ایک معرکہ سر کیا ہے۔

قارئین کی فرمائش پر زیرِ نظر شمارے سے مزاحیہ کالم کا اضافہ کیا جارہا ہے۔ ''چل میرے خامے'' علامہ کامل سہسرامی کا اپنا منفرد و مخصوص کالم ہے جس نے اپنے قاری کے مزاج اور معیار و تنوع کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ یقین ہے کہ اہلِ ذوق قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔''

انہوں نے اس میں اپنا نام نہ دے کر ایک فرضی نام تجویز فرمایا اس کے پس پردہ ان کی اپنی مصلحتیں تھیں لیکن حافظ ظہیر الدین قادری مدیرِ اعلیٰ استقامت کے اس اعلان کے پیچھے اپنی علیحدہ حکمتیں تھیں اور دونوں کی مصلحتوں کے مابین تبادلہ نہ ہوا تھا اس لیے انہوں نے

مدیرِ اعلیٰ استقامت کے اس اعلان پر سخت الفاظ میں احتجاج فرمایا چنانچہ ان کے ردِ عمل کی بنیاد پر مدیرِ استقامت کو اپنے اس اعلان پر دوسرے شمارے میں اعتذار شائع کرنا پڑا۔

گجرات میں قیام کے دوران علامہ کامل سہسرامی نے اسلام میں پیر پھیلانے والی موڈرن جماعت یعنی دیوبندیت کے ایوان پر مزاحیہ انداز میں طنز کے نشتر برساتے ہوئے ایک مضمون ''نجد سے سہارن پور تک'' ماہنامہ ''پاسبان'' میں اشاعت کے لیے روانہ فرمایا۔ مضمون کی اشاعت کے بعد ہر طرف سے تحسین ومرحبا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ پورے ملک میں ایک دھماکے کا احساس کیا گیا اور ''پاسبان'' کا دوسرا نام ''نجد سے سہارن پور تک'' پڑ گیا۔ حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی مدیرِ اعلیٰ ماہنامہ ''پاسبان'' الہٰ آباد نے اسے ''پاسبان'' کا مستقل عنوان بنا دیا۔ ظاہر ہے کہ یہی امر اپنے آپ میں اس کے مقبولِ عام وخاص ہونے کی بڑی سند ہے۔ علامہ کامل ''اظہارِ خیال'' کے تحت فرماتے ہیں: ''نہ جانے وہ کون سی ساعت تھی جب میں نے ''پاسبان'' کے لیے ''نجد سے سہارن پور تک'' کے نام سے پہلی مرتبہ مضمون بھیجا تھا۔ مضمون کے جواب میں مولانا (علامہ مشتاق احمد نظامی) کا حکم نامہ ملا کہ یہ ''پاسبان'' کا مستقل عنوان بنا لیا گیا ہے۔ اس کا نباہ تمہارے ذمے ہے۔''

ماہنامہ ''پاسبان'' میں سلسلے وار شائع ہونے والے اس مضمون کی مقبولیت کے پیشِ نظر مکتبۂ پاسبان نے اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ لیا۔ چنانچہ جب کتابی شکل میں یہ پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئی تو دیکھتے دیکھتے تمام کاپیاں ختم ہو گئیں اور پھر دوسرے ایڈیشن کی تیاری ہونے لگی۔ لیکن بعد میں قارئین وشائقین کی مسلسل طلب کے باوجود اس کا اشاعتی تسلسل بحال نہیں رکھا جا سکا۔

کسی بھی کتاب کے مطالعے سے پہلے صاحبِ کتاب کی فکر ونظر کی گہرائیوں میں اترنا ضروری ہوتا ہے۔ اور قلمکار کی اس قلمی کاوش کے پیچھے اسباب وعوامل کیا تھے؟ کس پس منظر میں یہ کتاب لکھی گئی، اس موضوع پر قلمکار نے قلم کیوں اٹھایا؟ میں سمجھتا ہوں ان پر نظر رکھے بغیر کتاب کے مطالعے کا حق ادا نہ ہوگا۔ علامہ کامل سہسرامی نے ''نجد سے سہارن پور تک'' کے

عنوان پر جو مستقل خامہ فرسائی کی، قلم گھسے، انرجی اور توانائی صرف کی، اس کے محرکات سے پردہ اٹھاتے ہوئے وہ خود رقم طراز ہیں: ”میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ مکر وریا کے مکروہ چہروں پر تقدس کی حسین نقاب ڈالے کچھ افراد ملّت کی شہہ رگ کاٹنا چاہتے ہیں جن کی نقاب کشائی ضروری ہے اور میں نے یہی کیا ہے کہ اپنی حیات کا مقصد یہی ہے۔

محمد بن عبد الوہاب نجدی کے ذریعے خانہ ساز توحید و شرک اور تنقیص الوہیت و شانِ رسالت کا جو طوفان نجد کی سرزمین سے اٹھا اسے ہندوستان میں سہارن پور سے تحریک کی شکل میں آگے بڑھا دیا گیا۔ اس طرح اس طوفانِ بدتمیزی نے دنیا بھر میں آباد مسلمانوں کے درمیان اختلاف و انتشار کی ایسی آگ بھڑکائی کہ آج پوری دنیا میں مسلمان مختلف خانوں اور طبقوں میں تقسیم ہو کر ذلت و رسوائی کا تماشہ بنے ہوئے ہیں۔“

ہندوستان میں اس خانہ ساز مذہب کو تحریک کی شکل میں آگے بڑھانے کی شیطانی جسارت کا آغاز اسماعیل دہلوی کے قلم سے ہوا۔ جس کے ردّ و تردید میں پہلے تو انہی کے گھرانے سے آواز بلند ہوئی۔ بعد میں اس زمانے کے اور بعد کے علمائے حق نے دہلوی کے افکار و نظریات کا کھل کر ردّ فرمایا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے افکار و نظریات کے ردّ و ابطال میں جتنی کتابیں منظرِ عام پر آئیں، شاید ہی کسی کے افکار و نظریات پر اس تسلسل سے ردّ و تردید کا سلسلہ قائم ہوا ہو۔ حضرت علّامہ شاہ عبد العزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر حضرت علّامہ فضل حق خیر آبادی تک اور حضرت علّامہ فضل رسول بدایونی سے لے کر اعلیٰ حضرت سیّدی امام احمد رضا فاضل بریلوی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تک اور ان کے بعد سے لے کر آج تک علمائے حق کے ذریعے اسماعیل دہلوی کے افکار و نظریات کے ردّ و ابطال میں کتابیں تحریر کی جاتی رہیں۔

سیّدی اعلیٰ حضرت نے تو اس خانہ ساز مذہب کے ردّ و تردید کو اپنا مشن بنا لیا۔ اعدائے دین، دشمنانِ رسول علیہ التحیۃ والثناء اور شاتمانِ رسول کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی گوشمالی نثر، نظم اور تقریر کے ذریعے تسلسل کے ساتھ فرماتے رہے۔ علّامہ کامل سہسرامی کا تبلیغی مشن بھی انہی

بزرگانِ سلف کے سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے۔ وہ تاحیات اسی مسلک پر مضبوطی کے ساتھ گامزن رہے۔ ان گندم نما جوفروشوں کے چہروں سے نقاب الٹ کر ان کے گندے، مکروہ اور گھناؤنے چہرے لوگوں کو دکھاتے رہے۔ اس کے لیے انہوں نے اپنی زبان اور قلم دونوں کا بحسن وخوبی استعمال فرمایا۔

علامہ کامل سہسرامی کے زورِ خطابت، قوتِ استدلال اور ناقابلِ تردید شواہد سے ایوانِ باطل میں زلزلہ آجاتا تھا تو وہیں ان کے قلم کی کاٹ بھی بہت تیز ہوتی تھی۔ زیرِ خنجر آنے والے شکار کو پھڑ پھڑانے کا موقع تک نہیں مل پاتا تھا اور وہ بہت چابکدستی سے اپنے شکار کو زیر کرنے میں کامیاب ہوجاتے۔

یقیناً اس باب میں وہ اپنی انفرادی شناخت کے حامل ہیں انہوں نے اردو زبان وادب میں رائج ایک اسلوب کو نئے بانکپن اور جمال سے نہ صرف یہ کہ آراستہ وپیراستہ کیا بلکہ اس کا قبلہ ہی بدل دیا۔ اردو طنز ومزاح نگاری میں چند حضرات کا سکہ آج بھی کھنکھنا رہا ہے۔ اور ان حضرات کی نگارشات بھی یقیناً اردو ادب کا سرمایہ ہیں لیکن اس کے باوصف یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ زبان وادب سے الگ ہٹ کر ان فن پاروں کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔ لیکن علامہ کامل سہسرامی کی نگارشات کو اس تناظر میں یہ خصوص حاصل ہے کہ زبان وادب اور لسانیات سے الگ ہٹ کر ان فن پاروں کی اپنی ایک حیثیت اور ان کا ایک انفرادی مقام ہے۔ یقیناً علامہ کامل سہسرامی نے طنز ومزاح نگاری کا قبلہ بدل کر اسے زندۂ جاوید بنادیا۔

بات میں بات پیدا کرنا اور مزاح کے تیور میں طنز کے ایسے چبھتے ہوئے تیر برسانا کہ دشمن بھی کراہ نہ سکے، یہ آپ کا اپنا خاص فن تھا۔ یقیناً یہ ان کی خداداد صلاحیت تھی۔ ان کی یہ صلاحیت انہیں دوسرے افراد کے درمیان ایک نمایاں پہچان اور علیٰحدہ شناخت دیتی ہے۔ ہنستے بولتے ایسی دوررس باتیں کہہ جانا جہاں خواص کا ہی ذہن جاسکے یہ ان کا اپنا مخصوص انداز تھا۔

نام نہاد تبلیغی جماعت کے امیر مولوی الیاس نے ''ملفوظات'' میں ایک مقام پر یہ تحریر کردیا کہ ''شیطان ملعون اگر مجھ فقیر کی شکل اختیار کرنے کی ذرہ برابر بھی کوشش کرے گا تو

جل مرے گا۔'' علّامہ کامل سہسرامی نے اپنی اختراع پسند طبیعت سے ایک مزاحیہ تمہید تحریر فرمائی اور پھر آخر میں اس تمہید کو کلائمکس پر پہنچاتے ہوئے امیر تبلیغی جماعت کی اس تحریر کو اپنے طنز کا بہت خوبصورتی کے ساتھ نشانہ بنایا۔

اسی طرح ایک مقام پر علمائے دیوبند کے خانہ ساز فتوے (کوا کھانا حلال ہے) پر طنز فرمانے کے لیے پہلے تو ایک بہت پیاری تمہید بیان کی اس کے بعد اس خانہ ساز فتوے پر طنز کے تیر برسائے۔ علمائے دیوبند کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے جس تیور اور لب و لہجے میں گفتگو فرماتے ہیں وہ دیدنی ہے۔

''انصاف'' و دیانت کا جنازہ نکالنے والو! پہلے اس بات کا اعلان کر دو کہ ہم علم کی منڈی میں بیٹھ کر ڈنڈی ماریں گے، گیہوں دکھا کر جو بیچیں گے، کوئی بھی میری کلائی تھامنے کی کوشش نہ کرے یا زبان و قلم کے سرکش ٹٹو میں ایسی لگام لگا دو جو پیر میاں کی عقیدت میں بھڑک کر انصاف و دیانت کی سڑک نہ چھوڑنے پائے۔ ہم اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم کریں، ان کی عظمت کے ترانے گائیں تو تمہارے پیٹ میں مروڑ ہونے لگے۔ خود ساختہ توحید کے آبگینے چور ہو جائیں، ہمیں بدعتی ثابت کرنے میں پھیپھڑے کی ساری قوت صرف ہو جائے۔ فتوؤں کی وہ بمباری کہ ہیروشیما کی یاد تازہ ہو جائے۔ علم و دیانت کے دعویدارو! اگر ہم نے بقول تمہارے ''سرکار دو عالم کو اتنا بڑھایا کہ رسالت و توحید کا تانا بانا ایک ہو گیا'' تو بھی تم سے اچھے رہے کہ جو کچھ بڑھایا اللہ کے رسول کو بڑھایا، اس کی عظمت کے گیت گائے جس کی عظمت کے مقابلے میں کائنات ہیچ ہے، لیکن تم نے کمپیٹیشن میں یہ حماقت کر لی کہ سارے بزرگوں کی عظمت کو بالائے طاق رکھ کر تھانوی جی کی سیرت کو قرآن کے بعد درجہ دے دیا۔ اگر تمہارے یہاں دیانت نام کی کوئی شئی ہے تو خدارا بتاؤ کہ شخصیت پرستی کے اس جدید جنم کے بعد احادیث نبوی، سیر صحابہ اور امت کے فرزندان جلیل کی تاریخ کا کیا حشر ہوگا؟ تھانوی جی کی سیرت کے آگے سیرت رسول کی اتنی کھلی تنقیص عقیدت مندی کا اتنا

بھیانک انکشاف توحید کی قسم میں داخل ہے۔

ظالمو! یوم حساب بہت قریب ہے، دیکھنا ہے کہ قبر سے حشر تک کی ہولناک منزلوں میں تھانوی جی کی اندھی عقیدت تمہارے کام آتی ہے یا سرکار دو عالم ﷺ کی تعظیم ہم بدعتیوں کے۔

اللہ رے خودساختہ قانون کا نیرنگ
جو بات کہیں فخر وہی بات کہیں ننگ

ایک مقام پہ علامہ کامل سہسرامی کے لب ولہجے کی کاٹ محسوس کیجئے:

"اب ان عقل کے اندھوں سے کوئی پوچھے کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں علم کے نام پر دیانت وانصاف کا خون کیوں کر رہے ہو؟

خانوادۂ نبوت کی دشمنی کی اور کیا انتہا ہوگی کہ تم نے تاریخی حقائق نہ صرف پس پشت ڈال دیئے بلکہ طبری، ابن اثیر اور سیوطی جیسے مورخین کو اندھیری رات میں لکڑیاں جمع کرنے والا بتایا اور شہادت کربلا کے عظیم حادثے کو محض ایک مقامی سانحہ۔

انگریزوں کے کاسہ لیس اور ایجنٹ اگر مارے جائیں تو آپ ان کو شہید ثابت کرنے میں پھیپھڑوں کی ساری قوت صرف کر دیں اور ان کی تاریخ مرتب کرنے کی دھن میں زمین وآسمان کے قلابے ملادیں۔ ایک ظالم کی موت کو بین الاقوامی سانحہ قرار دیں اور تبصرہ نگاری کی مسند پر بیٹھ کر عقیدت مندی اور شخصیت پرستی کی دھن میں یہاں تک بک جائیں کہ سربکف، تیغ بکف وہ (اسماعیل دہلوی اور سید احمد رائے بریلوی) عزت کی اس وادی تک پہنچ گیا جس کے آگے کوئی وادی نہیں۔

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

چند سطروں کے بعد آپ کا مبصرانہ تیور مزید وضاحتوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

''حق کی آواز بلند کرنے اور ایک غیر مستحق مدعی خلافت سے مسلمانوں کونجات دلانے کی خاطر اپنی اولاد، اپنے گھر اور خود اپنی حیات عزیز تک کو انہوں نے قربان کر دیا اور یہ آں بدولت کے نزدیک محض ایک مقامی سانحہ ٹھہرا۔ اور بنا بپتی شہداء عزت کے اس مقام تک پہنچ جائیں۔ جس کے آگے کوئی وادی نہیں، ان کے شہید ایک جست میں عزت کی ساری حدوں کو پھلانگ گئے، صحابیت اور نبوت بھی اس کے پیچھے رہ گئی، کیوں کہ جب اس کے آگے کوئی وادی ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ سب کے سب پیچھے ہی رہے۔ اور ان کے پیشواؤں کا ٹٹو سب سے آگے نکل گیا۔

شخصیت پرستی کی دھن میں انصاف ودیانت کی لاش پر نفسانیت کا عفریت جب رقص برہنہ کرتا ہے تو تاریخی حقائق اسی طرح مسخ ہوتے ہیں ع

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے''

دریدہ دہن اور گستاخ قلمکار محمود احمد عباسی کی ''خلافت معاویہ ویزید'' نامی کتاب پر مدیر ماہنامہ ''تجلی'' دیوبند عامر عثمانی نے تبصرہ کرتے ہوئے عباسی کے سر میں سر ملانے کی جسارت کی اور یہ لکھا:

''لامتناہی پروپیگنڈے نے یزید کی شخصیت کو جتنا بھیانک، حضرت حسین کی شہادت کو حد درجہ مظلومانہ اور دیگر تفصیلات کو جس قدر ڈرامائی بنا دیا ہے ان کو تعصب سے بلند ہو کر ٹھنڈے اور تحقیق پسند دل ودماغ سے اگر اس کتاب ''خلافت معاویہ ویزید'' کا مطالعہ کیا جائے تو چند جزئیات کے علاوہ من حیث المجموع اس سے اتفاق ہی کرنا ہوگا''

اب ذرا اس غیر علمی اور احمقانہ تبصرے پہ علامہ کامل سہسرامی کے فاضلانہ تبصرے کا تیور ملاحظہ فرمایئے۔

''ماتم کیجئے اور ہو سکے تو سر دیواروں سے ٹکرایئے کہ اب تک آپ کس فریب میں مبتلا تھے اور ایمان لایئے کہ ''لامتناہی پروپیگنڈے نے حضرت حسین کی شہادت کو حد درجہ مظلومانہ بنادیا ہے'' کہیے کہ حضرت امام حسین کی شہادت مظلومانہ نہیں بلکہ حد درجہ ظالمانہ تھی اگر دل ودماغ اس پر آمادہ نہ ہوں تو انہیں سولی دے دیجئے یا سہارن پور سے دوسرا دل ودماغ منگوا کر فٹ کرالیجئے اور اگلے کو نکال پھینکیے۔

اب اس کا جواب مدیر ''تجلی'' کے ذمہ کہ شہادت ظالمانہ بھی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ میرے خیال میں ہمارے دیوبند شریف کے حدود میں ظلم وشہادت کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے اور دونوں کی حیثیت سگی بہنوں سی ہے۔ حضرت شہید ملک یاغستان میں مسلمانوں پر ڈنڈا آزمانے پہنچ گئے، اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ محض دنیا کے لئے اپنے بھائیوں کے خون سے ہولی کھیلی جائے اور مارے جائیں تو شہید ہو جائیں۔ ظلم وشہادت کے گٹھ جوڑ کی ایسی نادر مثال اور کہاں مل سکتی ہے۔''

مدیر ''تجلی'' نے ایک مقام پر اس طرح کا تبصرہ قلم بند کیا۔

''تقدیر میں شہادت تھی۔ یہ شہادت ابتداءً تو ایک غم انگیز مقامی سانحے سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن دو ایک صدی بعد اہل حرص وہوس نے اس کو افسانہ بنادیا۔''

تاریخی صداقتوں کو منھ چڑانے والے اس تبصرے پر علامہ کامل سہسرامی کا مبصرانہ

تیور ملاحظہ کیجئے:

''ملاحظہ فرمایئے کہ شہادت کا اقرار ہے اور واللہ کہ یہ شہادت طاعون کے مرض میں نہیں، میدان کارزار میں، تلواروں کے سائے میں ملی ہے، جہاں ایک طرف وحشت و بربریت تھی، ظلم وستم تھا اور دوسری طرف صبر ورضا اور شکر وانابت تھی اور طرفہ یہ کہ یہ شہادت ہما شما کی نہیں بلکہ نواسۂ رسول اور جگر گوشۂ بتول کی ہے، ان تمام خصوصیات کے باوجود یہ شہادت آں بدولت کے نزدیک ایک مقامی سانحہ ہے۔''

جی ہاں! بالکل مقامی سانحہ، جس طرح آپ کے شہر میں ایک بھلے آدمی کا انتقال ایک مقامی سانحہ ہوتا ہے اسی طرح شہادت امام بھی۔ اس انکشاف عظیم پر یزید بھی اپنی قبر میں پچھاڑیں کھا گیا ہو اور عالم وجد میں سارنگی بجانے لگا ہو تو کیا تعجب؟''

تبصرے کا ایک ایک لفظ آپ کی اعلیٰ تبصرہ نگاری کی شہادت پیش کر رہا ہے تیور میں بلا کا طنز پوشیدہ ہے۔

ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ کا قلم کچھ اس انداز میں گل افشانی کرتا ہے: ''کتاب لے کر اوپر سے دیکھا نیچے سے دیکھا لیکن خاک سمجھ میں نہیں آیا'' اول تو کتاب کے سرورق پہ مختلف قسم کے موٹے موٹے عنوانات اور پھر عربی کے جملے کا ترجمہ بھی ایسا کہ مجھ جیسا پرائمری پاس انسان زندگی بھر نہ سمجھ سکے۔ سب سے موٹے عنوان کے ترجمے کا پہلا لفظ تھا ''علماؤں'' قاعدہ بغدادی سے لیکر پرائمری تک کی ایک ایک کتاب دیکھ لی لیکن کہیں نہ ملا کہ علماؤں واحد ہے کہ جمع۔ اگر بتادیں ناظرین تو نذر کروں گا ایک کتابچہ صوفی چقندر شاہ سے لے کر بیر نگ، دوسرا تاریخی نام پڑھ کر تو عقل شریف سات سلام کر کے رخصت ہوگئی حضرت شیخ کی سوا پانچ پیسے کی نیاز بھی مانی لیکن سمجھ میں نہ آیا خواب میں دیکھا کہ سارے تاریخ گو سر پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا آپ بھی پڑھیئے اور منہ پر دو تھپڑ

ماریئے اور کوتاہی عقل کا ماتم کیجئے، یعنی اس کتاب کا لاجواب تاریخی نام ہے۔

غدرِ بے باک عالم

۱۳۸۰ھ

یقین ہے کہ اس معاملے میں آپ سب میری ہی طرح ہوں گے اور زندگی بھر اس کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔ آپ کہیں گے کہ باہر کے حسن ورعنائی کا حال یہ ہے جو پھر اندر کیا ہے؟ ذرا اسے بھی بتادو، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں۔ ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

علامہ کامل سہسرامی کی تنقید نگاری کا معیار بہت بلند، لب ولہجہ بے پناہ شائستہ اور کاٹ بہت زبردست ہے، اشارے کنائے میں ایسی دوررس باتیں کہہ جانا جہاں خواص کا ذہن جاسکے یہ ان کا خاص فن تھا۔ ماہنامہ "استقامت ڈائجسٹ" کانپور میں طنز و مزاح کے کالم "چل مرے خامے" کے عنوان سے شائع ہونے والے ایک مضمون میں وہ رقم طراز ہیں:

> "جناب! جس ضمیر کی آپ بات کر رہے ہیں وہ ماضی کا ضمیر تھا جو عرصہ ہوا آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے۔ آج کی دنیا میں اس چھوٹے موٹے ضمیر کے لئے کوئی جگہ نہیں جو ہاتھ لگاتے ہی مرجھا جائے۔ آج کا ضمیر تو انا و صحت مند ہی نہیں بلکہ بڑا سخت جان اور آل پروف ہے۔ سائنسی ضمیر میں ایسے اجزائے ترکیبی شامل کیئے گئے ہیں کہ مرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جبل پور کے فسادات کے متصل بعد قسم کھانے والے خانۂ کعبہ کا غلاف تھام کر قسم کھاتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان ہر طرح خیر و عافیت کے ساتھ ہیں، ان کی جان، مال عزت و آبرو سب محفوظ ہے اور ضمیر کو

موت نہیں آتی۔ چڑھانے والے سمادھیوں پر پھولوں کی مالا چڑھاتے ہیں اور ضمیر پر نزع طاری نہیں ہوتی۔ لینے والے جگت گرو کے چرنوں میں پہنچ کر آشرواد حاصل کرتے ہیں اور ضمیر زندہ رہتا ہے۔ بننے والے مسلم پرسنل لاء کا نام لے کر ایم، ایل سی بنتے ہیں اور ضمیر کی زندگی میں فرق نہیں آتا سیاسی اختلافات کی قربان گاہ پہ قوم کو بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے اور ضمیر کو موت تو کیا آئیگی معمولی قسم کا زکام بھی نہیں ہوتا۔''

اسی مضمون میں ایک دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

''اگر انٹرویو ہی ضروری ہے تو بمبئی میں ان عربوں سے انٹرویو لیجئے جن کے سروں پر اسرائیلی جارحیت کی ننگی تلوار لٹک رہی ہے اور بے نیازوں کی یہ جماعت تاج محل ہوٹل او براۓ کی معطر راتوں میں زندگی کا بھر پور ثبوت پیش کر کے روایتی اولوالعزمی اور بہادری کے ساتھ ان کا مذاق اڑانے میں مصروف ہے۔ جو بے اندازہ تیل اور سونے کی دولت کو عسکری طاقتوں کے حصول پر صرف کرنے کی بجائے کاکل ورخسار کی خریداری پر صرف کر رہے ہیں، اسرائیلی طاقت شیطانوں کو انگوٹھا دکھا رہی ہے۔''

علامہ کامل سہسرامی کے زرنگار قلم سے جو تبصرے تحریر ہوئے ہیں وہ ان کے صاحب بصیرت تبصرہ نگار اور قا؛ں تنقید نگار کی کھلی شہادت پیش کر رہے ہیں۔

''نجد سے سہارن پور تک'' آپ کی ایک لازوال تحریر ہے۔ جس میں ان کی انشاء پردازی، طنز و مزاح نگاری، تبصرہ نگاری، ناقدانہ بصیرت کے زریں نقوش ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

''نجد سے سہارن پور تک'' علامہ کامل سہسرامی کی اختراع پسند طبیعت کا ایک عظیم

شاہکار ہے۔ اردو زبان وادب میں طنز ومزاح نگاری کا سلسلہ کوئی نیا نہیں بلکہ پرانا ہے۔ اس فن میں چند لوگوں کے نام کا سکہ آج بھی کھنکھنا رہا ہے۔ جن میں فکر تونسوی، ابراہیم جلیس، شوکت تھانوی کے نام سرِ فہرست ہیں یقیناً ان حضرات نے اردو زبان وادب میں طنز ومزاح نگاری کو ایک منفرد اور نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ ان کی نگارشات بھی یقیناً اردو زبان وادب کا ایک بڑا سرمایہ ہیں۔ علامہ کامل سہسرامی نے طنز ومزاح نگاری کا قبلہ تبدیل فرمادیا۔ انہوں نے مذہبی ادب میں پہلی مرتبہ طنز ومزاح نگاری کی بنیاد رکھی۔ یقیناً اس باب میں ان کی نگارشات کے سر اوّلیت کا سہرا بندھتا نظر آتا ہے۔ ''نجد سے سہارن پور تک'' ماہنامہ ''پاسبان'' الٰہ آباد میں قسط وار شائع شدہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ علامہ مشتاق احمد نظامی کی تحریک وترغیب پر علامہ کامل سہسرامی نے اس کالم کے تحت مستقل خامہ فرسائی فرمائی۔ بعد میں اس کی مقبولیت کے پیشِ نظر مکتبۂ پاسبان الٰہ آباد کی جانب سے اسے کتابی شکل میں منظرِ عام پر لایا گیا۔

''پاسبان'' کی اشاعت کے زمانے میں حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی اور علامہ کامل سہسرامی کے درمیان تعلقات میں گہرائی پیدا ہوئی۔ وہ جب ''پاسبان'' میں بحیثیت قلمکار شامل ہوئے تو ان کی قلمی صلاحیتوں کے جوہر کھلنے لگے۔ وہ یقیناً خداداد صلاحیتوں اور لیاقتوں کے مالک تھے۔ اردو ادب میں طنز ومزاح نگاری کا فن بہت قدیم ہے لیکن مذہبی ادب میں اسے آج تک کسی نے متعارف نہیں کرایا۔ آپ پہلی مرتبہ فن طنز ومزاح کو مذہبی ادب میں متعارف کرانے کے لیے میدانِ عمل میں اترے۔ آپ نے اس نئی طرح کی کچھ اس طرح داغ بیل ڈالی کہ پہلے مضمون نے ہی پورے ملک میں دھماکہ کردیا اور پھر دھیرے دھیرے ''پاسبان'' کا نام ہی ''نجد سے سہارن پور تک'' پڑ گیا۔ اس سے کالم کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ مشتاق احمد نظامی کی یہ تحریر لائق مطالعہ ہے۔

''یہ اس دور کی بات ہے جب ''پاسبان'' سے کلیۃً میرا ذہن وابستہ تھا۔ ''نجد سے سہارن پور تک'' کے لیے میری نظرِ انتخاب فاضل جلیل مولانا محمد میاں کامل پر گئی اور مراسلات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پہلے تو وہ ہچکچائے لیکن کہنے سننے سے تیار ہوگئے۔ وہ تیار ہی

نہیں ہوئے بلکہ ایسے مردِ میدان ثابت ہوئے گویا ایوانِ دیوبندیت کے لیے مدتوں سے پٹرول بارود لیے بیٹھے ہیں۔ صرف اس کا انتظار ہے کہ کوئی کہے آتش گیر مصالحوں کو لے کر آگے بڑھیے۔ چنانچہ یہی ہوا پہلے ہی دھماکے میں پورا ملک گونج اٹھا، ہر طرف سے تحسین و مرحبا کی آواز بلند ہوئی۔

آخرش ہوا یہ کہ ''پاسبان'' کا دوسرا نام ''نجد سے سہارن پور تک'' پڑ گیا۔ جس نے ایک بار پڑھ لیا، ماہ بماہ بغیر پڑھے اسے چین نہیں۔ ''نجد سے سہارن پور تک'' سنجیدہ مزاح اور علمی و معلوماتی ظرافتوں کا حقیقت پسندانہ نچوڑ ہے۔''

گونا گوں مصروفیات یا پھر کچھ دیگر وجوہات کی بنا پر کچھ دنوں تک ''نجد سے سہارن پور تک'' کا کالم ماہنامہ ''پاسبان'' میں شامل نہ ہو سکا تو قارئین پاسبان نے اس کالم کی غیر حاضری پر اپنے احساسات سے مدیر پاسبان علامہ مشتاق احمد نظامی کو آگاہ کیا۔ چنانچہ علامہ نظامی نے علامہ کامل سہسرامی کو قارئین پاسبان کے احساسات سے نہ صرف آگاہ فرمایا بلکہ اس مقبول ترین کالم پر مستقل خامہ فرسائی کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ قارئین کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے تحت صاف محسوس ہونے لگا کہ پاسبان اس مخصوص کالم کے بغیر اپنی جامعیت کے باوصف نامکمل اور ادھورا ہے۔ پھر جماعت میں کوئی ایسا قلمکار بھی نہ تھا جو اس کالم کا کماحقہٗ حق ادا کر سکے۔ بات جب منت سماجت سے طے نہ ہو سکی تو آخر میں مدیر پاسبان علامہ مشتاق احمد نظامی نے پاسبان میں قارئین پاسبان کے نام ایک اطلاع شائع فرمادی، ''ان دنوں ماہنامہ پاسبان کے مخصوص کالم ''نجد سے سہارن پور تک'' کے کالم نگار کچھ روٹھے روٹھے سے ہیں لہٰذا قارئین پاسبان سے اپیل ہے کہ وہ انہیں منائیں ذیل میں مولانا کامل سہسرامی کا پتا درج کیا جاتا ہے۔''

''نجد سے سہارن پور تک'' کے ذریعے انہوں نے پورے ملک میں اپنی انفرادی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔ اور باطل فرقوں کے عقائد فاسدہ پر کچھ اس انداز سے تیشہ کاری کی کہ وہ طبقہ بھی ان کے طنز و مزاح پر لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اور بقول مرزا غالب دہلوی ؎

کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب
گالیاں کھاکے بھی بےمزہ نہ ہوا

علامہ کامل سہسرامی نے سہسرام کے جس ماحول میں اپنے شعور کی آنکھیں کھولیں، اس میں علم و ادب، فکر و نظر اور شعر و سخن کے آبشار پھوٹ رہے تھے۔ شیدؔا سہسرامی، مانوسؔ سہسرامی، مسکینؔ سہسرامی، نازشؔ سہسرامی، قمر نعمانی، حشرؔ سہسرامی، ضیاءؔ سہسرامی، حاذقؔ سہسرامی، قمرؔ سہسرامی جیسے اساطین علم وادب کے نغموں سے یہاں کی وادیاں گونج رہی تھیں۔ علامہ کامل سہسرامی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ایک طویل عرصے تک الٰہ آباد، مبارکپور، بریلی شریف اور احمد آباد میں سکونت پذیر رہے۔ وطن کی کشش، اہل وطن کی محبت اور پھر دار العلوم خیریہ نظامیہ کی ضروری پکار پر ان کے قدم بیرونِ وطن ٹھہر نہیں سکے۔ وہ سہسرام آئے تو یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ اس زمانے میں سہسرام کا ماحول بالکل الگ تھلگ تھا۔ تقریباً ہر ماہ کہیں نہ کہیں طرحی وغیر طرحی مشاعرے کا اہتمام ہوتا جس میں مقامی اہل علم وادب حصہ لیتے۔ علامہ کامل کی افتادِ طبع بھی کچھ الگ نہ تھی وہ فطری شاعر تھے۔ ہر چند کہ انہوں نے یہ فن اپنایا نہیں لیکن انہیں اس پر یقیناً یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ آپ کا مزاج کچھ الگ تھلگ واقع ہوا تھا۔ وہ ضرورت کے تحت اپنا فکری چراغ جلاتے، حسبِ موقع نعت یا غزل کہتے اور شریکِ مشاعرہ ہوجاتے۔ ان کی شاعری میں آمد ہی آمد کے جلوے نظر آتے ہیں، آورد کی شاعری نہیں تھی۔ مشاعرے سے ایک دو گھنٹہ قبل اپنا کلام مکمل کرتے اور شریکِ مشاعرہ ہوکر داد و تحسین حاصل کرتے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ کچھ اشعار ہوگئے، انہیں جیسے تیسے کاغذ پر نقل کیا اور پھر مشاعرے میں شرکت کے لیے نکل پڑے، باقی اشعار راستے میں کہے۔ اس طرح کلام مکمل کرکے شریکِ مشاعرہ ہوجاتے۔ رفتہ رفتہ وہ سہسرام کے مشاعروں کی روح بنتے جارہے تھے۔ کسی مشاعرے کا تصور بھی ان کے بغیر ناقص و ادھورا سمجھا جانے لگا۔ علامہ کامل سہسرامی اب مشاعروں میں صرف شاعر وادیب کی حیثیت سے شرکت نہیں فرماتے بلکہ اب مشاعروں کے اہتمام کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں ہوتی اور وہ ایک کامیاب ناظمِ

مشاعرہ کی حیثیت سے ان مشاعروں کو بحسن وخوبی انجام تک پہنچاتے۔

ذیل میں ان کی رباعیات، قطعہ اور اشعار تحریر کیے جاتے ہیں جن سے ان کی شعر گوئی کے مزاج ومنہاج کا اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

رباعی

خوابِ مزدور میں ہے سرخ سویرا آباد	ظلم کی دھوپ سے مرجھا گئے غنچوں کے دہن
ہے مساوات کی ضامن وہی ذاتِ اقدس	جس نے طبقات کی تفریق کے کاٹے بندھن

یا

دانش و فکر کی گرمی سے پگھلتے جذبات	شبنمی پیار کے سائے میں سکوں پا نہ سکے
چاند تاروں کی کلائی تو مروڑی لیکن	اپنی دنیا میں کوئی چاندنی پھیلا نہ سکے

تکلفات اور پھر اتنے تکلفات کے بعد	حضور آئے ہزاروں تغیرات کے بعد
نہ کوئی آپ سا آیا نہ کوئی آئے گا	نہ اس حیات سے پہلے نہ اس حیات کے بعد

نورِ جمال گنبدِ خضرا نظر میں ہے	یعنی فرازِ عرشِ معلیٰ نظر میں ہے
خوفِ گنہ کی تیرہ شبی ختم ہوگئی	اپنی شفاعتوں کا سویرا نظر میں ہے
میں عرض مدعا مرے سرکار کیا کروں	پڑھ لیجیے تمام تمنا نظر میں ہے

انقلاباتِ رنگیں کا مرکز ان کی مخمور انگڑائیاں ہیں
کالے کالے یہ بادل نہیں ہیں ان کے گیسو کی پرچھائیاں ہیں
اس قدر کیوں ہے جانے کی جلدی رات باقی ابھی دو گھڑی ہے
ان اجالوں سے دھوکہ نہ کھاؤ یہ تو عارض کی تابانیاں ہیں
ان کا طرزِ تغافل تو دیکھو یہ انوکھا تجاہل تو دیکھو
پوچھتے ہیں ہمیں سے وہ آکر کہیے اس وقت کامل کہاں ہیں

مجھے بے پناہ خوشی کا احساس ہو رہا ہے کہ طویل عرصے سے شائقین کی طلب جس کتاب کے لیے تھی اسے عزیز محترم مولانا رحمت اللہ صدیقی نے ترتیبِ نو کے ساتھ رضا دار المطالعہ کے پلیٹ فارم سے منظرِ عام پر لانے کا عزمِ مصمم کرلیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قوتِ بازو کو مزید توانائیاں عطا فرمائے۔ مولانا رحمت اللہ صدیقی کو سیّدی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ سے والہانہ اور جذباتی لگاؤ اور تعلق ہے۔ پھر اس تعلق میں اس قدر گہرائی و گیرائی ہے کہ ان کے نام لیواؤں، عقیدت کیشوں اور نیاز مندوں کو بھی وہ فراموش نہیں کرتے اور حاسدین رضا کا تعاقب کرنے میں لیت ولعل کے شکار نظر نہیں آتے۔ وقت کی منھ بولتی صداقت تو یہی ہے کہ اعلیٰ حضرت سیّدی امام احمد رضا فاضل بریلوی آج اہل سنّت و جماعت اور دیگر جماعتوں کے درمیان نشانِ امتیاز بن چکے ہیں جو ان کا عقیدت مند ہے وہ صحیح العقیدہ سنّی ہے اور جس نے اس نام پر ناک بھوں چڑھائی اس کے عقیدے میں یقیناً کھوٹ ہے۔ اسی حقیقت کا اقرار آج سے برسوں قبل میرے وطن کی اہم شخصیت حضرت علّامہ قادر بخش رحمۃ اللہ علیہ فرما چکے ہیں۔

مدیرِ اعلیٰ ''الکوثر'' دار العلوم خیریہ نظامیہ سہسرام

پاسبان ملت علاّمہ مشتاق احمد نظامی

خطابت کا چڑھتا سورج ڈوب گیا

سہرام صوبۂ بہار کا ایک مردم خیز علاقہ ہونے کی حیثیت سے ہندو پاک کا بہت ہی متعارف اور مشہور شہر ہے، بڑے بڑے علماء اور فضلاء نے اس کی گود میں پرورش پائی۔ شاید میں کچھ بہک گیا ہوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو کہ انہی یگانۂ روزگار شخصیتوں نے سہرام کو مدینۃ العلماء بنایا اور اس کی سربلندی کو ہمدوشِ ثریا کر دیا۔

مولانا کامل کے والد ماجد صدر العلماء حضرت علاّمہ مولانا محمد فرخند علی نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے ممتاز ترین عالمِ دین اور صاحبِ سلسلہ درویش صفت بزرگ تھے۔ گویا علمِ ظاہر اور علمِ باطن کا سنگم تھے، اپنے معاصرین میں وحیدِ عصر اور فریدِ دہر تھے۔ حضرت علاّمہ کی کتاب "تسہیل المنطق" جو منطق کے ابتدائی مسائل پر مشتمل ہے وہ بہت سے مدارس میں داخلِ نصاب ہے جس کی حیثیت "تعریف الاشیاء" جیسی ہے۔ یہ کتاب اردو زبان میں ہے۔ مسائل کے تقریبِ فہم میں طلبا کے لیے بہت مفید ہے۔ ایک کامیاب اور کہنہ مشق مدرس ہونے کی حیثیت سے حضرت علاّمہ نے منطق کی ابتدائی و بنیادی مصطلحات کو جس خوبصورتی سے سمیٹنے کی کامیاب کوشش فرمائی ہے اس کے پیشِ نظر بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سمندر کو کوزے میں بھرنے کی یہ کتاب منھ بولتی تصویر ہے۔ اسے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں درسیات کو سہل الحصول بنانے کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ غالباً یہی وہ داعیہ تھا جس کے تحت علاّمہ مرحوم کو منطقی اصطلاحات کو اردو کا لباس پہنانا پڑا اور آج کے

عصری مزاج نے تو اسے عادتِ ثانیہ بنالیا ہے۔ ہر دور میں ہوتا چلا آرہا ہے کہ ماہرینِ فن نے عصری مزاج کے مطابق نصابِ تعلیم کی تدوین وترتیب دی اور متنوں پر اسی اعتبار سے شروح وحواشی کا التزام کیا گیا ہے۔ یہ علامہ مرحوم کا احسان ہے کہ انھوں نے درسِ نظامی کے مبتدی طلبہ کے لیے اردو زبان میں ایک ایسا ذخیرہ جمع فرما دیا ہے جس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی ہے ورنہ ''صغریٰ''، ''کبریٰ''، ''ایساغوجی''، ''تعریف الاشیاء'' جیسے رسائل کے مطالعہ سے طلبہ کے ذہن پر معنویت کے ساتھ ایک غیر مانوس زبان فارسی کا بھی بوجھ پڑتا ہے بالفاظِ دیگر جسے دوہری محنت سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ دار العلوم خیر یہ نظامیہ حضرت علامہ فرخند علی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی یادگار ہے جس کی علمی خدمات سے صوبۂ بہار آج بھی سدا بہار ہے۔ گوشے گوشے میں آپ کے تلامذہ ملک کی معیاری درسگاہوں میں مسندِ تدریس پر فائز ہیں۔ ماضی بعید میں مدرسہ خیر یہ نظامیہ کو صوبۂ بہار میں وہی حیثیت حاصل تھی جو اس وقت مظہر اسلام اور منظرِ اسلام کو حاصل ہے۔ یعنی مدرسہ خیر یہ نہ صرف یہ کہ سنّی ادارہ سمجھا جاتا بلکہ دوسروں کو سنّیت کی سند اور سرٹیفکیٹ دیتا تھا۔ خدائے قدیر مدرسہ خیر یہ کو آسیب روزگار سے محفوظ و مامون رکھے آمین۔

کامل ایک ایسے ہی علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے ایسے باپ کی گود میں آنکھیں کھولیں، وہ اپنے علم میں کیسا راسخ اور کردار وعمل میں کتنا محتاط و منفرد ہوسکتا ہے۔ عام شہرت تو یہ ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے مگر کامل کی کہانی اس کہاوت سے کچھ الگ تھلگ ہے کسی دور میں یقیناً لوگ سہسرام سے پہچانے گئے لیکن آج کا سہسرام کامل سے پہچانا جاتا تھا۔ کامل کی تاریخ کا یہ حصہ اعلیٰ حضرت سیّدنا امام احمد رضا کی تاریخ سے جزوی حیثیت سے ملتا جلتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے پیرومرشد نے یہی تو فرمایا تھا کہ مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ خدا جب مجھ سے پوچھے گا کہ تو کیا لایا ہے تو میں کیا جواب دوں گا۔ لیکن جب اعلیٰ حضرت داخلِ سلسلہ ہوئے تو آپ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کاندھے کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ اب اگر داورِ محشر نے سوال کیا تو میں کہوں گا احمد رضا کو لایا۔ یہ ایسا مرید تھا جس پر پیر کو بھی فخر تھا۔

کامل کی تاریخ بھی کچھ ایسی ہی ہے مولانا فرخند علی، مولانا محمد صدیق، مولانا ضیاء الحسن، حکیم مسیح الزماں وغیرہ بزرگوں سے سوال ہوا تو غالباً وہ کامل ہی کو پیش کریں گے۔ کامل ایسے سپوت تھے جو فخرِ خاندان بھی ہوئے اور قومی، ملّی رہنما بھی۔ کامل سہسرام کی زمین سے آسمان بن کر اٹھے، ستارہ بن کر چمکے، ہلالِ نو کی شکل ابھرے، حتیٰ کہ اب وہ فنِ خطابت کے بدرِ کامل اور افقِ صحافت کے چڑھتے ہوئے سورج تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں الٰہ آباد کی معروف درسگاہ مدرسہ سبحانیہ میں درسِ نظامی کی متوسط یا منتہی کتابیں پڑھ رہا تھا اس وقت کامل مدرسہ سبحانیہ میں عربی گرامر کی ابتدائی کتابیں پڑھ رہے تھے۔ ابھی ہم دونوں کا خاص تعارف بھی نہیں تھا۔ البتہ کامل کے عزیز حضرت مولانا ضیاء الحسن کے چھوٹے بھائی مولانا محمود الحسن میرے ہم سبق تھے۔ کچھ دنوں بعد مولانا کامل الٰہ آباد سے مبارکپور چلے گئے۔ پھر حضرت علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی کے ہمراہ احمد آباد پہنچے اور دار العلوم شاہ عالم احمد آباد سے فارغ ہوئے۔ برسوں گجرات کے ایک قصبہ کسمڑھی میں امام وخطیب رہے اس وقت گجرات کا مہینوں دورہ کرتا اور کامل بھڑوچ، انکلیشور وغیرہ کے پروگراموں میں میرے ساتھ رہتے۔ حتیٰ کہ اب وہ مجھ سے اتنے قریب ہوگئے کہ وہ ابتدائی مقرر کی حیثیت سے میرے جلسوں میں تقریر کرتے۔ ان کا اندازِ تقریر دیکھ کر یہ کہاوت یاد آجاتی ہے ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' اٹھان اچھی تھی اور دھیرے دھیرے اس طرح ابھرے کہ اب وہ صفِ اوّل کے مقررین میں شمار کیے جاتے تھے اور اب تو یہ عالم تھا کہ ان کے ہوتے ہوئے خود تقریر کرنا نہیں چاہتا۔ دل یہی چاہتا کہ میرا وقت بھی انہیں مل جائے۔

ہائے افسوس! کہ خطابت کا چڑھتا سورج ڈوب گیا اور میدانِ خطابت کے تیز گام مسافر نے اپنا سمتِ سفر بدل دیا۔ کامل ابھی گجرات کی رات کو دن بنا ہی رہے تھے کہ مدرسہ خیریہ کی ضرورتوں نے انہیں پکارا اور عقیدت ومحبت کی زنجیر میں بندھے ہوئے سہسرام پہنچ گئے۔ اور یہ گرہیں اتنی مضبوط تھیں کہ عمر بھر نہ کھل سکیں۔ سہسرام مولانا کامل کا وطنِ مالوف تھا۔ ہر ایک سے شناسائی اور رسم وراہ تھی۔ کامل مردانہ وار اس میدان میں اترے اور اپنی

مردم شناس اور خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر جو پرزہ جہاں فٹ ہوسکتا تھا وہیں فٹ کرنا شروع کردیا۔ اس طرح خیریہ نظامیہ کی مدھم رفتار تیز سے تیز تر ہوگئی اور کامل منتشر فوج کے قائد اور امیرِ کارواں بن گئے۔ رئیسِ ملت الحاج محمد جہانگیر عرف بھولا میاں کی رفاقت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا مسجد سے لے کر مدرسہ تک کی عمارت و انتظام میں بھولا میاں کی دلچسپی نے کامل کی اس طرح حوصلہ افزائی کی کہ ان کے کام نے اپنوں کا دل جیت لیا اور غیروں نے ان کی خداداد صلاحیتوں کا لوہا مان لیا۔ اب ایسے بے لوث خدمات انجام دینے والے کہاں ملیں گے؟ مولانا کامل اب چھوٹوں کی انجمن سے نکل کر بڑوں کی صف میں حاشیہ نشین ہوچکے تھے وہ دن دور نہ تھا کہ آج کا حاشیہ نشین کل کا صدر مجلس ہوکر مسند نشین ہوتا مگر زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ہمارا کامل ایک پرانی رہگزر کا نیا مسافر بن گیا۔ اب دھیرے دھیرے کامل کانفرنسوں اور مرکزی جلسوں کی روح بن چکے تھے۔ ان کے بغیر کسی کانفرنس کا کوئی تصور نہ ہوتا۔ سنی جمیعۃ العلماء ہر سال ۱۲ رمحرم الحرام کو شہیدِ اعظم کانفرنس کرتی ہے میں قائد ملت مولانا سیّد شاہ اسرار الحق کی معیت میں حالات کے تحت تجاویز کی سرخیاں متعین کرلیتا اس کے بعد انھیں محتاط طور پر قانون کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے مولانا کامل اور مولانا اسلم بستوی کے سپرد کردیا جاتا اور انہی کے ڈھلے ڈھلائے الفاظ میں تجاویز سنائی جاتیں افسوس! اب وہ محفل سونی ہوگئی۔ کامل کو میں نے تاجدار کے دور میں بہت قریب سے دیکھا سب تھک جاتے مگر کامل نہ تھکتے رات کو تین بجے تک ایک ہی رفتار سے قلم چلتا اور اس وقت تک تکیے پر سر نہ رکھتے تاوقتیکہ تاجدار کی ایک ایک سطر سے مطمئن نہ ہوجاتے۔ انوار ہر چند کہتے، کامل میاں اتنی مشقت نہ اٹھایئے آپ اس ادارے کے غلام نہیں مالک ہیں مگر ایک نہ سنتے درجنوں اخبارات دیکھنا اس پر لال پنسل سے نشانات لگانا پھر خبروں کا انتخاب ان پر تنقید و تبصرہ، تحقیقی اور تنقیدی مقالے کی ترتیب اور پھر مضامین سپردِ قلم کرنا وہ یہ تمام امور بیٹھے بٹھائے پختہ کار منجھے منجھائے صحافی کی حیثیت سے انجام دیتے جس کے نتیجے میں نشیمن بنگلور اور بعض دیگر ویکلی اخبار کی روشنی مدھم ہوگئی تھی اگر تاجدار ویکلی عمر پاتا تو آج صفِ اوّل

کے اخبارات میں اس کا شمار کیا جاتا۔ یہ جو کچھ بھی تھا کامل اور انوار نظامی کی صلاحیتوں کا نتیجہ تھا۔ بہت سے لوگ خود کو سیاسی کہتے تو ہیں مگر سیاست کی سین نہیں جانتے مگر کامل نے ایک کامیاب سیاست داں ہونے کے باوجود آج کی گندہ سیاست کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ جگر مرادآبادی کی زبان میں ان کا یہ کہنا تھا ۔

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

نشاۃ ثانیہ کے بعد اب ماہنامہ پاسبان کی ۹۵/فی صد ذمہ داری مولانا کامل سے متعلق تھی۔ اپریل ۱۹۷۹ء کے شمارے میں امامِ اعظم نمبر کا اعلان انہوں نے اپنے مرضی سے کیا اور اس سلسلے میں ۱۲/ مارچ کو انہوں نے مجھے جو خط بھیجا وہ حسب ذیل ہے اور میرے نام ان کی زندگی کا یہ آخری خط ہے جو ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

برادرم مخدوم! السلام علیکم

تاریخ کی تبدیلی محض آپ کی خاطر کر رہا ہوں۔ اب ۶/۵/۴ مئی جلسہ کی تاریخ رکھ دی ہے، آخر کی دو تاریخوں میں آپ کی شرکت لازمی ہے، ایک دن کے لیے آنا ہو تو نہ آیئے گا، منظوری کا جواب بہت واضح اور غیر مبہم عنایت کیجیے۔ اب دیگر حضرت سے آپ کے جواب کے بعد رابطہ قائم کروں گا اس لیے جواب عنایت فرمائیں۔ آج ہی ممبئی کے پتے پر بھی ایک لفافہ لکھ چکا ہوں۔ آج ٹیکم گڑھ جاتے ہوئے الٰہ آباد ٹھہرا۔ اپریل کے شمارے میں ''امامِ اعظم نمبر'' کا اعلان آرہا ہے۔ اس نمبر کے لیے جو عنوانات میری سمجھ میں آئے پیش خدمت ہے۔ باقی حذف واضافہ آپ کرلیں۔ جن علما سے جس عنوان پر مضمون مطلوب ہو انہیں عنوان کے ساتھ آپ اپنی طرف سے لکھ دیں۔ لیکن جن لوگوں کے متعلق یقین ہو انہی کو لکھیں باقی اس ہیچمدان کے لیے چھوڑ دیں، کوشش کروں گا کہ کوئی عنوان چھوٹنے نہ پائے۔ اپنے موضوع سے الگ ہو کر کوئی مضمون نمبر میں شائع نہ ہوگا ورنہ نمبر چوں چوں کا مربہ ہو جائے گا۔ اگر پاسبان کو ٹھیک ٹھکانے کا معیاری رسالہ بنانا ہے تو اس بات کی چھوٹ عنایت

کیجیے کہ ہم دونوں جو مناسب سمجھیں گے شائع کریں گے۔ سب کو خوش رکھنے کے التزام میں آپ کی خواہش کا احترام اگر ضروری ہو گیا تو رسالہ اعلانات و اخبارات کا مجموعہ ہو جائے گا۔ اس مرتبہ چالیس صفحات میں چار صفحہ اعلانات کی نذر رہے جو یقیناً پڑھنے والوں پر بوجھ ہو گا۔ اس سلسلہ میں آپ کی رائے خیالات اور تفصیلی جواب کے لیے شدت سے منتظر رہوں گا گھر سب خیریت ہے۔ کامل سہرامی

کامل ایک کامیاب شاعر بھی تھے۔ کم کہتے مگر اچھا کہتے ہر چند کہ یہ فن انہوں نے اپنایا نہیں لیکن اس فن میں انہیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ کامل خوش اخلاق، خوش خوراک اور خوش پوش تھے، بہت ہی خلیق اور ملنسار تھے۔ آرام پسند بھی تھے، محنتی بھی تھے، سینے میں ایک بے غبار دل بھی تھا کینہ پرور نہ تھے وہ تن کے اجلے من کے کالے نہ تھے۔ دل کی بات زبان پہ تھی وہ اپنوں اور بیگانوں میں منافق نہ تھے۔ حق نگہ، حق گو، حق پسند اور حق پرست تھے۔ ہمارے خلاف اگر کوئی کچھ کہتا تو اس کی اطلاع ہمیں ضرور دیتے، وہ ہم سے بے تکلف بھی تھے اور نیازمند بھی، وہ ہم سے اس طرح ملتے جیسے چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے۔ بالکل اسی طرح وہ انوار کو اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے اور انوار انہیں بڑے بھائی کی طرح مانتے۔ بسا اوقات انوار ڈانٹ بھی کھاتے مگر کامل کی محبت میں کوئی فکر و پرواہ نہیں کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ انوار اور کامل دو قالب ایک جان ہیں۔ ہنستے بولتے، لڑتے جھگڑتے، کھاتے پیتے دونوں کے دن کٹ جاتے۔ میں ان دونوں کے درمیان اتنی ہی دیر بیٹھتا جتنی دیر تک کامل میری ضرورت محسوس کرتے۔

میری زندگی آلام و مصائب سے اس طرح چکنا چور ہے کہ ہر کروٹ اضطراب اور ہر سانس کراہ ہے۔ میری شب غم کو روشن چراغ تو در کنار جگنوؤں کا بھی سہارا نہ ملا۔ ہر صبح درد و کرب ہے ہر شام شامِ غم اس طرح زندگی کا ایک طویل سفر ہم نے طے کیا۔ اب زندگی کے نئے موڑ پر کامل میرے لیے قوتِ بازو تھے۔ تاجدار سے پاسبان تک، پاسبان سے مکتبہ تک، مکتبہ سے دارالعلوم غریب نواز تک، اگر یہ تمناؤں اور آرزوؤں کا کوئی ڈھانچہ ہے تو کامل اس کی روح تھے۔ کامل میرے منھ لگے بھی تھے اور حد درجہ میرا احترام بھی کرتے تھے۔ جب

انہیں کوئی بات منوانی ہوتی تو بھیانظامی کہہ کر لپٹ جاتے ،ان کی والہانہ ادائے محبت کے بعد میں کوئی بات ٹال نہ سکتا۔اب وہ میرے گھر کے ایک فرد بن چکے تھے۔انوار سے ان کی دانت کاٹی دوستی تھی۔وہ انوار کو ڈانٹتے بھی اور پیار بھی کرتے۔میرے غریب خانے کا ایک کمرہ کامل میاں کے کمرے سے معروف ومشہور ہے۔وہ تقریری پروگرام پر الہ آباد سے آتے جاتے تو کوئی ایک ٹرین چھوڑ دیتے۔اگر ضرورت ہوتی تو انوار کو اسٹیشن بلاتے اس تاکید کے ساتھ کہ سوئیں، حلوہ، شیر مال، کباب ساتھ لانا۔انوار پورے اہتمام کے ساتھ پہنچتے،آفاق منا بھی ساتھ ہو جاتے۔کامل میاں پہلے ہی سے ان دونوں بچوں کے لیے سہسرام کا تلکٹ ٹوفی اور مٹھائی ساتھ رکھ لیتے۔یہ دونوں ہنسی خوشی گھر آتے اور کہتے،اب ہم لوگ کامل میاں کے یہاں مدرسہ خیریہ میں پڑھنے جائیں گے۔ہمارے گھر مہمان کی طرح نہ رہتے اپنی پسند کا کھانا خود پکواتے۔کھچڑی، چنے کا حلوہ، بھنا گوشت، سیخ کباب، دہی بڑے یہ ان کی محبوب ومرغوب غذائیں تھیں۔انوار انہیں ان کی پسند کا کھانا کھلواتے اور کامل رات دن ایک کر کے ہفت روزہ تاجدار کی ایک ایک سطر میں الفاظ کے موتی پروتے۔اس دور میں کئی کئی کاتب بیٹھے رہتے، لکھتے لکھتے کاتب تھک جاتے مگر کامل کا رواں دواں قلم نہ رکتا۔ تاجدار ہی کے دور میں میں نے ان کی بے پناہ علمی وفکری صلاحیتوں کو جانچا پرکھا۔وہ آرام پسند ضرور تھے مگر جب کام آجاتا تو ایک مردِ مجاہد اور مزدور کا روپ دھار لیتے۔اگر مدرسہ خیریہ نظامیہ ان کی علمی یادگار ہے تو تاجدار کا فائل ان کے قلم کا شاہکار۔تاجدار ایک ایسا آئینہ ہے جس میں کامل کی بے غبار تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کے بے شمار نقوش تاجدار کے صفحات پر ابھرے اور بکھرے ہوئے ہیں۔میرا کامل قلم ہی کا تاجدار نہ تھا بلکہ اپنے معاصرین میں فنِ خطابت کا ایسا پیش رو امام المقررین تھا جس کی گردِ راہ نے اوجِ ثریا کو منزلوں پیچھے کر دیا۔کامل جس وقت صدری یا شیروانی کی سج دھج سے جھومتے جھامتے ہنستے مسکراتے اسٹیج پر قدم رکھتے تو عوام میں ہلچل مچ جاتی، سرگوشیاں ہوتیں وہ دیکھو کامل میاں آگئے۔اور جس وقت وہ خطابت کی کرسی پر بیٹھ کر الفاظ کی چاند ماری اور گولہ باری کرتے تو

ایسا محسوس ہوتا کہ ہم کسی کانفرنس میں نہیں بلکہ رزم گاہ میں بیٹھے ہیں، جہاں چاروں طرف سے توپیں انگارہ اگل رہی ہیں اور گولوں کی برسات برس رہی ہے۔ کامل اپنی گرجدار آواز میں شوکتِ الفاظ سے جب قوم کو خطاب کرتے تو بادلوں کے گرجنے اور بجلیوں کے تڑتڑانے کا یقین ہوتا۔ کامل کشورِ قلم کا پاسبان و تاجدار اور میدانِ خطابت کا ابھرتا شہسوار تھا۔ کامل ہماری کانفرنسوں کی روح تھے۔ اب وہ اعتماد کی ان منزلوں کو چھو رہے تھے کہ آنکھ بند کر کے تمام دستاویزان کے سپرد کر دی جاتی۔ کامل نے ہمارا کام بہت ہلکا کر دیا تھا۔ جو کام ان کے ذمہ کیا وقت سے پہلے انہوں نے اسے پورا کیا۔ اب تدریجاً انہیں اپنی ذمہ داریوں کا بھرپور احساس ہوتا جارہا تھا۔ اور اپنی ذہنی، فکری اور قلمی صلاحیتوں سے اکابر کا دل جیت رہے تھے۔ کامل نے خطابت کو بحیثیت فن نہیں استعمال کیا بطور مشن استعمال کیا۔ خطابت کے پس منظر میں مذہب اہل سنّت و مسلکِ اعلیٰ حضرت کی نمائندگی و ترجمانی کا انہیں بھرپور احساس تھا اور ان کی یہی ادا عوامی شہرت اور مقبولیت کا سبب بنتی رہی۔ کامل نے جیتے جی کبھی اپنے مسلک کا سودا نہیں کیا۔ انہوں نے سب کچھ گنوایا مگر مسلکِ اعلیٰ حضرت کی آبرو اور اس کا وقار بحال رکھا اور اس کے دامن پہ کوئی آنچ نہ آنے دی۔ ان کی اسی ادا نے مجھے ان سے قریب تر کر دیا۔ کامل اپنوں کے لیے بہت سی خوبیوں اور محاسن کا ایک جیتا جاگتا مردِ آہن تھا۔ جس کی ایک للکار سے دشمنانِ مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کے کلیجے کا خون پانی ہو جاتا۔ کامل اپنوں کے لیے گوناگوں خوبیوں کا ایک حسین و شاداب گلدستہ تھا اور حریفوں کے لیے شمشیر براں و شعلۂ جوالہ تھا۔ وہ کیا گیا کہ رونقِ بزم چلی گئی اور ہنستی بولتی انجمنوں کی بہار رخصت ہوگئی۔

میں نے برسوں پہلے جو چراغ روشن کیا تھا حوادثِ زمانہ سے اس کی لَو تو مدھم ہوگئی مگر جو روشنی پھیل چکی ہے اس کی تابانی نہیں گئی۔ یہ اس دور کی بات ہے جب پاسبان سے کلیۃً میرا ذہن وابستہ تھا۔ ''نجد سے سہارنپور تک'' کے لیے میری نظرِ انتخاب فاضل جلیل مولانا محمد میاں کامل سہسرامی پر گئی اور مراسلات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پہلے تو وہ ہچکچائے لیکن کہنے سننے سے تیار ہو گئے۔ وہ تیار ہی نہیں ہوئے بلکہ ایسے مردِ میدان ثابت ہوئے گویا ایوانِ

دیو بندیت کے لیے مدّتوں سے پٹرول بارود لیے بیٹھے ہیں، صرف اس کا انتظار تھا کہ کوئی کہے، آتش گیر مصالحوں کو لے کر آگے بڑھیے۔ چنانچہ یہی ہوا پہلے ہی دھماکے میں پورا ملک گونج اٹھا۔ ہر طرف سے تحسین و مرحبا کی آواز بلند ہوئی۔ آخرش یہ ہوا کہ پاسبان کا دوسرا نام نجد سے سہارن پور تک پڑ گیا۔ جس نے ایک بار پڑھ لیا، ماہ بماہ بغیر پڑھے اسے چین نہیں۔ ''نجد سے سہارن پور تک'' سنجیدہ مزاح اور علمی و معلوماتی ظرافتوں کا حقیقت پسندانہ نچوڑ ہے۔ مولانا کامل اپنی اس طرزِ نگارش میں بالکل یگانہ و منفرد ہیں۔ بات میں بات پیدا کرنا اور ہنستے بولتے ایسی دور رس باتیں کہہ جانا جہاں خواص ہی کا ذہن جا سکے، یہ ان کا خاص فن ہے، یہ ایک خداداد صلاحیت ہے جس نے انہیں دوسروں سے ممتاز کر دیا ہے۔

میرا کچھ چھن تو ضرور گیا ہے۔ مگر فیصلہ نہیں کر پاتا کہ میرا بازو کٹ گیا یا دوست بچھڑ گیا یا میرا بھائی مجھ سے جدا ہو گیا۔ اب ایسا لگتا ہے کہ خود میری زندگی مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جماعت ایک بڑے خطیب، ایک عظیم مناظر، ایک لائق مدرس اور ایک شہرہ آفاق صحافی سے محروم ہو گئی۔

کامل کا صدمہ کسی فرد، کسی خاندان اور کسی شہر کا نہیں ہے بلکہ ملک کی ایک بہت بڑی جماعت کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ کامل نے اپنی ذکاوت، فراست، خطابت، صحافت اور کردار و عمل کے پیچھے ایک مستقل تاریخ چھوڑ دی ہے۔ یہ مدرسہ خیریہ نظامیہ اور دار العلوم غریب نواز کے کسی لائق فرزند کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ بوجھ اپنے کاندھوں پہ اٹھالیں اور کامل کی شخصیت سے دنیا کو روشناس کرائیں۔ یہ ہماری بہت بڑی جماعتی کمزوری ہے کہ تاریخ ساز شخصیتیں اٹھ جاتی ہیں مگر ہم ان کی زندگی کے زریں کارنامے دنیا کے سامنے پیش نہیں کر پاتے۔ تعجب کا مقام ہے کہ ہمارا حریف پیتل کو سونا کہہ رہا ہے اور ہم سونے کو سونا اور ہیرے کو ہیرا نہیں کہہ پاتے۔ کاش! یہ رسم کہیں ٹوٹے اور ایسا سپیدۂ سحر نمودار ہو جس کی گود میں زندگی کا ہر زاویہ ابھر اور نکھر سکے۔ جماعت کے ہوش مند ایسی شمعیں جلاتے جن کے اجالے ہر اندھیرے پر چھا جاتے۔ مفکر، مدبر، خطیب، مقرر، مدرس، مناظر، شاعر اور

صاحبِ بصیرت کا دوسرا نام کامل تھا، جو ہم سے رخصت ہو گئے۔ جس نے ہر حال میں ناموسِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء پر جان دینے کی قسم کھائی تھی۔ آخرش دشمنِ مصطفیٰ کو للکارتے ہوئے محبوب کے قدموں پر جان ہی دے دی۔

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے ناز پر
عمر بھر کی بےقراری کو قرار آ ہی گیا

❀❀❀

ندیم گورکھپوری

نجد سے سہارن پور تک: ایک مطالعہ

''نجد سے سہارن پور تک'' مولانا محمد میاں کامل سہسرامی کی ایک گرانقدر تصنیف ہے جو ماہنامہ پاسبان میں قسط وار شائع ہوئے چند مضامین کا مجموعہ ہے۔

''نجد سے سہارن پور تک'' نہ تو کوئی ناولٹ ہے اور نہ افسانوں کا مجموعہ، بلکہ طنز و مزاح، چٹکیوں اور اٹکھیلیوں سے بھرپور ایک کتاب ہے جو فیشن ایبل مذہب یعنی ایوانِ دیوبندیت پر ظرافت کے ہتھیار سے ایک مکمل حملہ ہے ساتھ ہی اس کے غلط عقائد کی نقاب کشائی بھی۔

مدیر پاسبان اس کا سبب تالیف یوں بیان کرتے ہیں، ''میں نے برسوں پہلے جو چراغ روشن کیا تھا، حوادثِ زمانہ سے اس کی لَو تو مدھم ہوگئی مگر جو روشنی پھیل چکی ہے اس کی تابانی نہیں گئی۔ یہ اس دور کی بات ہے جب کہ پاسبان سے کلیۃً میرا ذہن وابستہ تھا۔ ''نجد سے سہارن پور تک'' کے لیے میری نظرِ انتخاب فاضل جلیل مولانا محمد میاں کامل پر گئی اور مراسلت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پہلے وہ ہچکچائے لیکن کہنے سننے سے تیار ہوگئے۔ وہ تیار ہی نہیں ہوئے بلکہ ایسے مردِ میدان ثابت ہوئے، گویا ایوانِ دیوبندیت کے لیے مدتوں سے پٹرول، بارود لیے بیٹھے ہیں۔ صرف اس کا انتظار تھا کہ کوئی کہے کہ آتشگیر مصالحوں کو لے کر آگے بڑھیے۔ چنانچہ یہی ہوا پہلے ہی دھماکے میں پورا ملک گونج اٹھا۔ ہر طرف سے تحسین و مرحبا کی آواز بلند ہوئی۔''

آگے چل کر ''نجد سے سہارن پور تک'' کے پیمانے میں تولتے ہوئے مولانا کامل کا وزن اس طرح متعین فرماتے ہیں، ''نجد سے سہارن پور تک سنجیدہ مزاح، علمی و معلوماتی

ظرافت کا حقیقت پسندانہ نچوڑ ہے۔ مولانا کامل اپنے اس طرزِ نگارش میں بالکل یگانہ و منفرد ہیں۔ بات میں بات پیدا کرنا اور ہنستے بولتے ایسی دور رس باتیں کہہ جانا، جہاں خواص ہی کا ذہن جا سکے یہ ان کا خاص فن ہے۔ یہ ایک خداداد صلاحیت ہے، جس نے انہیں دوسروں سے ممتاز کر دیا ہے۔"

اردو کے طنز و مزاح نگاروں میں مرحوم جلیسؔ، شوکت تھانویؔ، فکر تونسوی، خواجہ عبدالغفور وغیرہ قابلِ ذکر ہستیاں ہیں۔ اگر ان مزاح نگاروں کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں مرحوم جلیسؔ کی طنز نگاری اور اسلوبِ بیان سب سے الگ پایا جائے گا۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ جلیسؔ کی طنز نگاری حقیقت سے زیادہ قریب ہے، یعنی یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ افسانوی دنیا میں جو مقام پریم چند اور منٹو کو حاصل ہے طنز و مزاح نگاری میں وہی مقام جلیسؔ کا ہے۔

شوکت تھانوی، ابراہیم جلیسؔ، خواجہ عبدالغفور، فکر تونسوی اور مولانا کامل سہسرامی کی طنز نگاری کے سرسری جائزے کی بجائے اگر تنقیدی مطالعہ کیا جائے تو صاف پتا چلے گا کہ مولانا کامل نے طنز و مزاح نگاری کو ایک نئی شاہراہ پر لا کھڑا کیا ہے جہاں ان کا طرزِ نگارش طنز و مزاح کی آخری حد کو چھو رہا ہوتا ہے۔

کامل سہسرامی کا اندازِ بیان شوکت تھانوی سے کافی ملتا جلتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شوکت تھانوی کی طنز اور کامل سہسرامی کا مزاح دونوں سگے بھائی بہن ہیں۔ مگر شوکت سے کہیں زیادہ جلیسؔ کا فن حقیقت سے قریب ہے اور مولانا کامل سہسرامی کی صداقت پسندی تو جلیسؔ سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئی ہے۔

اردو کی ترویج و اشاعت اور زبان کو سنوارنے میں مولوی اور صوفیوں نے کافی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، مگر بالائے ستم کہ ہمارے ناقدین، محققین اور ماہرین لسانیات انہیں صرف مولوی سمجھ کر نظر انداز کر جاتے ہیں۔

اگر تاریخ ادب اردو کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتا چلے گا کہ مولوی اور صوفیوں نے اردو زبان میں اس وقت طبع آزمائی کی جب اردو زبان درحقیقت اپنا کوئی مستقل نام بھی نہ رکھتی

تھی۔ اس سلسلے میں ہم خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے ایک عزیز مرید اور صوفی شاعر حضرت امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سب سے پہلے پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر طاہرؔ رقم طراز ہیں، ''جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس نئی اور عام فہم زبان نے ترقی کرنی شروع کی، یہاں تک کہ تیرہویں صدی عیسوی یعنی پٹھان بادشاہوں کے عہد میں امیر خسرو دہلوی نے سب سے پہلے ادبی اغراض سے اس مخلوط زبان کے الفاظ استعمال کرنا شروع کیا ورنہ اس کے قبل لکھنے پڑھنے میں مطلقاً اس زبان کو دخل نہ تھا۔ امیر خسرو نے سب سے پہلے اس زبان میں جو حقیقتاً اپنا کوئی مستقل نام بھی نہ رکھتی تھی، شعر کہا۔ اور پہیلیاں، مکرانیاں اور دوسخنیں وغیرہ جیسی تمام چیزیں نظم کرنا شروع کیں۔''

اسی طرح الطاف حسین حالیؔ، حکیم مومن خان مومنؔ، اکبرؔ الٰہ آبادی اور امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی وغیرہ کی ادبی خدمات سے کون ہے جو متعارف نہیں۔

اردو نثر نگاری کے میدان میں بھی مولوی اور ملاؤں نے پہل کی۔ سیّد محمد حسینی، خواجہ بندہ نواز گیسودراز اردو کے پہلے نثار ہیں یہ اور بات ہے کہ انہیں اردو کا پہلا نثار تسلیم نہ کیا گیا۔ ان کی زبان اور اسلوب و بیان دیکھیے۔

''کہے، تحقیق خدا کے سیانے ستر ہزار پردے وجیالے، ہور اندھالے کے، اگر اس میں تے یک پردہ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔ ہو ایک وقت ایسا ہوتا ہے، سمجھو اور دیکھو بے پردہ اندھارے کے، وجیالے کے عارفان پر ہے۔ دے واصلان پر پردے نورانی دے واصلان کا صفا پردہ ہوتا ہے، سو محمد کا نور ہے عزیز۔۔۔ (معراج نامہ۔ بندہ نواز)

ان کی وفات کے چوہتر سال بعد ۹۶ھ ۱۴ء بعہد بہمنی اردو کا ایک اور نثار شاہ میران جی کے نام سے دکن میں جنم لیتا ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے بارے میں ڈاکٹر زور کا قول ملاحظہ ہو۔

''شاہ میران جی حضرت خواجہ بندہ نواز ہی کے سلسلۂ صوفیاء میں سے ہیں، انہوں نے اپنے بزرگوں کی طرح اردو ہی میں تعلیم و تلقین کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی کام کیا، انہوں نے بیجاپور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہیں۔ شاہ میران جی کی کئی نظمیں اور چھوٹے

رسالے اس وقت تک دستیاب ہو چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام بہت مقبول تھا۔ اور دور دور تک اس کی نقلیں پہنچ گئی تھیں۔'' اسی طرح آگے چل کر لکھتے ہیں۔

''میران جی نے نثر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ''شرح مرغوب القلوب'' ان کا لکھا ہوا ایک رسالہ نثر میں ہے، جس میں دس باب ہیں۔ ہر باب آیتِ قرآنی یا حدیث سے شروع کرتے ہیں اور پھر اس کا ترجمہ اور مختصر شرح کرتے ہیں۔''

نمونے کے طور پر یہ اقتباس پیش کرتے ہیں۔

''پیغمبر کہے خدا کی آشنائی جسے کوئی پوچھتا ہے انوکیاں تو رہکر انو تھے۔ تون سن ہور چپ نکو اچہ اس چار باتاں کا پند ہے یوں شریعت میں پہلے پاؤں رکھ کہ طریقت شریعت مینخ ہے۔''

''پیغمبر کہے کہ جو کچھ کام کرنے کا کوئی خدا کا ناؤں نا لے کر تو اد کام پائمال ہوگا۔ سرا نانوازنا خدا کوں، بہت کہ او پالن ہار ہے عالم کا۔'' (دکنی ادب کی تاریخ، مولفہ ڈاکٹر زور ص: ۲۲)

لیکن ان کی بھی نثری تخلیقات شرفِ قبولیت کا تاج پہن نہ سکیں۔ ایک زمانے کے بعد دکن میں ایک اور شاعر و نثار ملّا وجہی کے نام سے ابھرا، اس کی شعری و نثری دونوں تخلیقات مقبولِ عام ہیں۔ غالباً اردو نثر کی پہلی کتاب وجہی کی ''سب رس'' کو ہی تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد شمالی ہند میں پہلی اردو نثر ''دہ مجلس'' مولفہ فضلی بعہد محمد شاہ منظرِ عام پر آئی، اس کے بعد شمالی ہند کی ایک اور نثری کتاب مولفہ تحسین لکھنوی بعہد نواب شجاع الدولہ منظرِ عام پر آئی۔ غالباً اردو نثر کی یہی دو کتابیں شمالی ہند کی اوّلین یادگار ہیں، جنہیں قبولیتِ عامہ حاصل ہے۔ اس کے بعد مشرقی ہند میں فورٹ ولیم کی تصنیفات کا دور شروع ہوتا ہے، فورٹ ولیم کی تصنیفات میں میر امن کی ''باغ و بہار'' کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی۔''

''میر امن کی ''باغ و بہار'' اردو کی زندہ نثر سمجھی جاتی ہے، بعد میں محمد حسین آزاد نے ''فسانۂ عجائب'' لکھ کر اردو نثر کو ایک منفرد اسلوب و بیان دیا جو آج بھی رائج ہے۔''

اسی طرح مولانا کامل سہسرامی نے اردو میں طنز و مزاح نگاری کی روایت کو چھلانگ کر طنز و مزاح نگاری کے اصل مفہوم کو سمجھا۔ ان کی تصنیف ''نجد سے سہارن پور تک'' اس سلسلے کی ایک

کڑی ہے۔ وہ اپنی کتاب کا انتساب مدیر پاسبان کے نام کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

”مدیر پاسبان کی اس تحریک کے نام، جس نے میرے قلم کو نجد کے ریگستان میں بگٹٹ دوڑنے پر مجبور کیا۔“ اس انتساب کو دیکھ کر ہی قارئین ہنسنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی مزاح نگاری کے قائل ہو جاتے ہیں۔

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ کتاب اپنا جواب نہیں رکھتی اگر چہ اس میں اردو کے علاوہ فارسی اور عربی کے الفاظ کی بھی آمیزش ہے مگر فاضل مصنف کا اندازِ بیان کچھ ایسا آراستہ پیراستہ ہے کہ عام و خاص کی سمجھ میں بآسانی آجاتی ہے۔ مولانا کامل سہسرامی داستاں کی ابتدا یوں کرتے ہیں۔

”جرمن کا فلسفی جھوٹ کہیں چاہے جو کچھ بھی کہا ہو لیکن صحرائے نجد کے ایک افلاطون قسم کے منطقی کا مقولہ ضرور سن لیجیے، اگر سماعت نازک ہوگئی ہو تو میرے راہِ راست پر آنے کی دعا کیجیے، لیکن سن ضرور لیجیے۔“

”ہمیشہ اتنے بھیانک قسم کا سچ بولو کہ پوری انسانی آبادی چونک اٹھے اور دنیا کی ساری سچائی، ٹھوس واقعات، تاریخی صداقتیں خودکشی کر لیں۔“

یہ ایسی تمہید ہے کہ پڑھنے والے کو فوراً اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مولانا کامل کے مزاج میں ہی فصاحت و بلاغت اور سلاست کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی زبان و بیان پر اچھی طرح گرفت تھی، اور ان کے پاس الفاظ کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود تھا کہ عقلِ سلیم حیران رہ جاتی ہے۔

حضرت کامل سہسرامی کو صرف ایک اردو زبان پر ہی ملکہ حاصل نہ تھا بلکہ وہ فارسی اور عربی الفاظ و محاورات کا بڑی خوبی سے استعمال فرماتے تھے۔ یہ اقتباس میرے دعوے کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ ”میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ ایڈیٹر پاسبان صلح کلّی قسم کے سنّی ہیں۔ مومنین، کاملین، صادقین کی صف میں ان کا نام ہرگز نہیں آتا۔ لیکن اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑتا قہر درویش بر جان درویش۔ صبر کیے ان مبارک عین تبارک دن کا منتظر تھا۔ جب ان کا بھانڈا پھوٹ

چورا ہے پر پھوٹے اور ان کے غرور کا سر ٹوٹے۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِین.

کل صبر کا پھل مل گیا صوفی چقندر شاہ نے بات بات میں آخر کہہ ہی دیا کہ ’’پاسبان والے مشتاق میاں صلح کلی ندوی ہیں۔‘‘

مولانا کامل سہسرامی کی نثر نگاری انتہائی سادہ اور سلیس ہے، محاورات، تشبیہات اور استعارات کا جا بجا استعمال موسیقیت پیدا کر دیتا ہے اور قاری دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ داستان گوئی کے معاملے میں فاضل مصنف کو امتیازی درجہ حاصل ہے۔ زبان و بیان کی ساری خوبیاں مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ’’کانگریس ملک کی کتنی ہی مقبول جماعت ہو۔ کیسی ہی حکمرانی کی صلاحیت رکھتی ہو، لیکن یقین فرمایئے کہ جب کوئی لانبی داڑھی والا کھدر پوش ہو جاتا ہے تو پھر وہ نہ مولوی رہتا ہے نہ کانگریسی بلکہ دونوں کے درمیان کی چیز چھوٹو مداری (عرف چالباز شکاری) بن جاتا ہے جو اتنی مہارت و ہوشیاری سے جال ڈالتا ہے کہ غریب شکار کو پھڑ پھڑانے تک کا موقعہ نصیب نہیں ہوتا۔ بھانومتی کے پٹارے کا ایسا ایسا کرتب دکھائے گا کہ بس دیکھا کیجیے۔ ہاتھ کی صفائی ایسی کہ کتنے مداریوں نے تو شرما کر اپنا کام دھندا چھوڑ دیا۔‘‘

’’صوفی صاحب حضرت شیخ کے خاص الخاص عقیدت مندوں میں ہیں۔ جب کبھی شیخ کا ذکر آیا ان کی آنکھوں سے آنسو کے موٹے موٹے قطرے نکل پڑے۔ پیر صاحب کی تقلید میں ہمیشہ کھدر پہنتے ہیں پائجامہ اتنا محتاط کہ بس گھٹنوں سے ذرا سا نیچے رہتا ہے، دور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ نئے فیشن کی ہاف پینٹ ہے، کرتے کی لمبائی ہمیشہ جنے کے دھوکے میں ڈالتی ہے، سیاہ چمکتا ہوا چہرہ اس پر ڈیڑھ بالشت کی دودھ جیسی سفید داڑھی، گویا صبح و شام کا سنگم، لوگوں کو ہمیشہ قرآن و حدیث پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔‘‘

’’ہم نہیں سمجھ سکے کہ یہ رسول دشمنی ہے یا اپنے بزرگوں کی غلط عقیدت مندیوں کا غلط نتیجہ، آخر جب بات آپ کے گھر کی ہوتی ہے تو کیوں منہ میں دہی جم جاتا ہے اور رسالت کا معاملہ ہوتا ہے تو زبان و قلم دونوں اسی میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل پڑتے ہیں۔‘‘

فاضل مصنف ایک اچھے ظریف اور بلند درجہ انشا پرداز ہونے کے ساتھ ایک جگہ نقاد کی حیثیت سے بھی سامنے آتے ہیں۔ ''کتاب لے کر اوپر سے دیکھا، نیچے سے دیکھا لیکن خاک سمجھ میں نہ آیا، اوّل تو کتاب کے سرِ ورق پر مختلف قسم کے موٹے موٹے عنوانات اور پھر عربی کے جملے، ترجمہ بھی ایسا کہ مجھ جیسا پرائمری پاس انسان زندگی بھر نہ سمجھ سکے۔ سب سے موٹے عنوان کے ترجمے کا پہلا لفظ تھا ''علماؤں'' قاعدہ بغدادی سے لے کر پرائمری تک کی ایک ایک کتاب کو دیکھ ڈالا لیکن کہیں نہ ملا کہ ''علماؤں'' واحد ہے کہ جمع۔''

اسی طرح ''غدر بے باک عالم'' پر موصوف کا تنقیدی نظریہ ملاحظہ فرمائیے۔

''پوری کتاب مدیر پاسبان کی منقبت کا سدا بہار گلدستہ ہے، جس جملے پر نظر پڑتی ہے، ایک نئی خوشبو محسوس ہوتی ہے کہیں گلاب، کہیں موتیا، کہیں بیلا ہے کہیں چمیلی، کہیں چمپا ہے کہیں موگرا۔ میری قوتِ شامہ تو بالکل الٹی ہوگئی ہے۔ اس لیے ہر ہر جملے پر ناک پر رومال رکھنا پڑا، کہیں کہیں متلی بھی آئی۔ اگر آپ کی قوتِ شامہ صحیح ہو تو چند جملوں کی خوشبوئے جانفزا سے مشامِ روح کو معنبر کیجیے۔'' آگے چل کر مزید تحریر فرماتے ہیں کہ ''زبان و ادب کے اعتبار سے تو ایسی ہے کہ بس نثر میں شاعری ہی شاعری ہے، چچا غالب بھی قبر کے اندر طبلہ بجاتے ہوں گے۔ ملاحظہ ہو۔'' جو جواب بھیجا عواموں کی دانشت میں چھاپ کر شائع کرتا رہتا ہے۔'''' بے امتیازی کی بندش میں غرق رہا کرتا ہے۔'''' مئے جام خمار جوش زر کشی۔''

''لفظ خفیہ متعدد جگہ ''خوفیہ'' تحریر فرمایا گیا ہے۔''

لعنة الله علی الکاذبین۔ ''الصلحة الکلیة۔''

یعنی اخیر کا لفظ بھی آیت کا جز ہے۔''

''مبلغ علم ہے اس ذاتِ گرامی کے خلیفہ کا جس کا نامِ نامی ہمیشہ دو چار سطروں میں لکھا جاتا ہے۔ اور اس علم پر ہمت یہ کہ سارے علمائے اہل سنت کو للکار رہا ہے۔ چنانچہ اخیر میں درج ہے۔'' اگر چھیڑ چھاڑ کی ٹھہری تو اس سے بھی زیادہ وضاحت ممکن ہے۔''

''یعنی یہ کوئی سنجیدہ اعتراض نہیں بلکہ چھیڑ چھاڑ ہے۔ اب اس چھیڑ خوانی پر اس سے

زیادہ اور کیا کہا جائے کہ جب اللہ گدھا بنائے تو دو سینگ بھی عنایت کردے۔"

اس کتاب کی دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ فاضل مصنف نے جو اشعار ترتیب دیئے ہیں ان کا خالق کوئی اور ہے مگر سہرا کسی اور کے سر رکھتے ہیں۔ ایک جگہ آپ نے اکبرالہ آبادی کا ایک شعر نقل کیا ہے مگر شیخ سعدی کے نام منسوب کرتے ہیں۔

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتے بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتے بھی نہیں

اسی طرح موصوف نے ایک جگہ ۵ اشعار پر مشتمل ایک منظوم "ڈرکس کا ہے" پیش کیا ہے اور اس کی نسبت مرزا غالب سے جوڑی گئی ہے جو غالب کی نظم سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ کسی دوسرے کی تخلیق ہے ہاں! اس کا امکان بھی ہے کہ اس کے خالق خود فاضل مصنف ہوں۔

مختصر یہ کہ "نجد سے سہارن پور تک" مولانا کامل سہسرامی کی ایک ایسی لاجواب تصنیف ہے جو فصاحت و بلاغت اور سلاست و روانی کی فضا میں پرورش پاتی ہے نیز تشبیہات و استعارات، طنز و مزاح اور محاورات کے جابجا درست استعمال کی بنا پر چمنستانِ اردو کا سدابہار گلدستہ کہلانے کی مستحق ہے۔

دراصل مولانا کامل اپنی انہی خصوصیات کی وجہ سے اپنے معاصرین میں منفرد و یگانہ نظر آتے ہیں۔ اور اپنی اس تحریر کی روشنی میں خود کو ایک نقاد، انشاء پرداز اور اچھا طنز و مزاح نگار تسلیم کرنے پر مجبور کردیا ہے۔

چنانچہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ حضرت کامل سہسرامی کی یہ تصنیف ایک لاجواب شاہکار ہے اور ان کا یہ کارنامہ تاریخ ادب اردو میں سورج کی روپہلی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ افسوس! کہ عمر نے وفا نہ کی ورنہ اردو ادب کو آپ کی ذات سے مزید فائدہ پہنچتا، خدائے قدیر آپ کو جنّت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ بجاہ حبیبہ الکریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم۔

❀❀❀

شمس العلماء حضرت مفتی محمد نظام الدین قادری حبیبی

مولانا کامل سہسرامی: میری نگاہ میں

۱۹۳۵ء سے آج ۱۹۹۱ء تک کے دورِ تعلیم میں بے شمار پھول مجھ سے وابستہ رہے جن میں سے سہسرام کے معتد بہ ہیں۔ مجھے قدرت نے بہت سے جواہر پارے عطا فرمائے۔ جن میں کچھ عمیق مدرس، کچھ نکتہ رس مفتی، کچھ بلند پایہ مقرر بھی پیدا ہوئے جو اپنے اپنے دور میں بیش بہا موتی بن کر چمکے۔

جب میں یوپی کے مشہور ادارہ مدرسہ سبحانیہ میں تعلیم دے رہا تھا تو دو نونہال میرے سپرد کیے گئے ایک کا نام مشتاق نظامی اور دوسرے کا نام کامل سہسرامی تھا۔ یہ دونوں شکل و صورت میں عام انسانوں کی طرح ضرور تھے مگر اپنے اندر کچھ امتیازی شان رکھتے تھے۔ یہ خاموش تھے مگر اسی حالت میں ناطق و گویا بھی تھے۔ ابتدا میں چونکہ مولانا کامل کھیل کود کے بھی شوقین تھے اس لیے ان کے ابھرنے میں تھوڑی کچھ تاخیر ہوئی۔ مولانا مشتاق چونکہ میری تعلیم کے ساتھ ساتھ حضرت مجاہد ملت کی تربیت کے شکنجے میں دبے ہوئے تھے اس لیے ان کی وہ قوت نہ ابھر سکی لیکن جب مولانا کامل نے ہوش سنبھالا تو ان دونوں میں یہ امتیاز کرنا کہ ان میں پیش رو کون اور پس رو کون ہے مشکل ہو گیا۔ اور ان دونوں میں کتابوں کے افہام و تفہیم کی جو بات تھی اس میں کوئی فرق نہیں تھا۔ میں جب کبھی تقریر پر جایا کرتا تھا تو ان دونوں میں سے کسی کو ضرور ساتھ لے جاتا تھا اور اپنے پہلے کچھ تقریر بھی کرا دیتا تھا تاکہ ان لوگوں

میں تقریری صلاحیت ابھر سکے چنانچہ میں اس میں کامیاب بھی ہوا اور ان دونوں نے جہاں تدریس کو اپنایا وہیں تحریر وتقریر کو بھی فراموش نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریر کے میدان میں پہلے تو مشتاق نظامی تھے مگر چند روز کے بعد ہی مولانا کامل نے ان کے کندھے سے کندھا ملا دیا اور دوش بدوش ہوکر دونوں اسٹیج پر منتظر نگاہوں کے تارہ بن گئے۔ دین کی خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر گیا تھا اور سونے پر سہاگہ یہ ہوگیا کہ مولانا کامل سہرامی حضرت مجاہد ملت کے قریب سے قریب تر ہوتے گئے اور حضرت مجاہد ملت سے ان کو وہ قرب واعتماد پیدا ہوگیا کہ بہت کم لوگوں کو یہ شرف نصیب ہوا مولانا کامل سہرامی سے حضرت مجاہد ملت کو اس لیے بھی قلبی لگاؤ ہوا کہ کامل کے والد بزرگوار حضرت علامہ الحاج محمد فرخند علی رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت مجاہد ملت کو بڑی عقیدت مندی تھی اور وہ اس لیے کہ جب وہ مدرسہ سبحانیہ میں حضرت علامہ عبدالکافی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھتے تھے تو اس میں مولانا سجاد بہاری حضرت مولانا فرخند علی کے ہم سبق تھے مگر ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ مولانا کامل کے والد بزرگوار ہمیشہ حق کی تائید میں رہتے تھے اور مولانا سجاد بہاری ان کے خلاف رہتے تھے اور ان دونوں میں ہمیشہ نوک جھونک چلتی رہتی تھی اور مولانا عبدالکافی صاحب مولانا فرخند علی کی تائید وحمایت فرماتے تھے۔ اس بات سے حضرت مجاہد ملت رضی اللہ عنہ کامل مرحوم کو بہت اچھی نظر سے دیکھا کرتے تھے اور یہ فرماتے تھے ''الولد سر لابیہ'' بچہ اپنے باپ کا راز ہوا کرتا ہے۔

مولانا کامل سہرامی کے والد بزرگوار حضرت مولانا فرخند علی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا عبد الکافی الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے ان ہونہار شاگردوں میں سے ہیں جنھیں علومِ عقلیہ اور نقلیہ میں گہری دسترس حاصل تھی۔ علامہ فرخند علی رحمۃ اللہ علیہ علمِ تصوف میں بھی علوم کا بے پناہ خزانہ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت مولانا عبدالکافی رحمۃ اللہ علیہ کے ایما پر ایک کتاب فن تصوف میں لکھی ہے جس کا نام ''ارشادِ کافی'' ہے۔ یہ ایک عملی کتاب ہے لیکن اس زمانے میں عمل تو درکنار اس کتاب کا سمجھنا ہی دشوار ہوگیا ہے۔ بہر حال ان چیزوں سے حضرت مجاہد ملت کامل مرحوم سے بے پناہ تعلق رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر یہ ''صراطِ مستقیم'' کے علم

بردار ہو جائیں تو ان کے قدموں سے وابستہ ہو کر ایک دنیا مستفیض ہو سکتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان دنیا سے الگ ہو کر ایک الگ میدان میں سیر و تفریح کا شوق پیدا ہو گیا۔ چند سال نہیں بلکہ چند ماہ کے بعد ہی کامل سہسرامی کے قلب میں ایک ایسی کرن پھوٹی جس کا لازمی نتیجہ ہوا کہ آخر کار کامل مرحوم حضرت مجاہد ملّت کے نورانی صندوق کی طرف متوجہ ہو گئے یا کرائے گئے۔ جو کچھ ہوا ب راز و نیاز کی گفتگو شروع ہو گئی اور حضرت مجاہد ملّت کے روبرو یہ کہنا پڑا کہ سرکار میں نے سطحی طور پر بیضاوی پڑھی۔۔ اس پر علامہ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جب واصل اور عارف باللہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ پڑھتا ہے تو وہ دل میں یوں کہتا ہے، اَللّٰھُمَّ اَرْشِدْنَا طَرِيْقَ السَّيْرِ فِيْكَ لِيَتَمَحُوْ عَنَّا ظُلُمَاتِ اَحْوَالِنَا وَتميط غَوَاشِي اَبْدَانِنَا يستفيئ بِنُوْرِ قُدْسِكَ فَنَرَاكَ بِنُوْرِكَ اے اللہ تعالیٰ! تو اپنی ذات میں سیر کرنے کے راستے کی ہدایت فرمانا کہ ہمارے حالات کی ظلمتیں مٹ جائیں۔ جسم کے حجاب اور پردے ہٹ جائیں تا کہ تیرے مقدس نور سے تیری ذات کا مشاہدہ کر سکوں۔''

مگر میرا یہ پڑھا ہوا صرف ظاہری ہے اور زبان پر ترجمہ ہی ہے۔ براہِ کرم آپ اپنی نورانیت کی شعاعوں میں حقیقت کا مشاہدہ کرا دیں۔ اور یہ کہہ کر قدموں سے لپٹ گئے۔ حضرت مجاہد ملّت کا ترحّم جوش میں آیا اور انہوں نے کامل سہسرامی کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ کامل مرحوم نے نورانی اقتباسات کا مقام اپنے قلبِ مصطفیٰ کو بنا لیا اور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کلمے بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً کی تعمیل میں سرگرداں ہو گئے۔ اب کیا تھا سوائے تبلیغ اور رشد و ہدایت کے کچھ باقی نہیں رہ گیا۔ جہاں جائیں تبلیغ ہی ایک مشن تھا۔ جس کا اندازہ لگانا ہو تو ہندوستان کے مختلف شہروں کی گلیوں سے دریافت کیجیے تو گلیاں فصیح زبان سے یہ کہیں گی کہ ایک مردِ مجاہد جو مجاہدِ ملّت کا دیوانہ تھا ہم لوگوں میں سے ہو کر احکامِ شرعیہ کی تبلیغ کا علم لے کر سرگرداں پھرتا اور حق کو حق اور باطل کو باطل کر کے ساری دنیا کو دکھاتا ہوا گذر جاتا تھا۔ اسی جنون میں ہندوستان کے مشہور شہر کلکتہ میں حق کے پروانوں نے انہیں دعوت دی۔ یہ تشریف لے گئے اور اپنے پیر و مرشد کے مشن کو اجاگر کرنے لگے۔ اور جہاں گزرتے تھے حقانیت کا

بول بالا ہونے لگتا تھا۔ اسی ذوقِ تبلیغ میں ایک اجلاس سے مخاطب ہوکر نورانی ضوفشانی کررہے تھے کہ دورانِ تقریر قلب پر گہرا اثر پڑا اور وہیں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔ ڈاکٹروں کی بھیڑ لگ گئی اور سب نے یہی فیصلہ کیا کہ ان کا ہارٹ فیل کرگیا۔ مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ حادثہ ڈاکٹروں کی سوجھ بوجھ سے بالاتر تھا، ان کی وہاں رسائی بھی نہیں تھی جہاں کامل سہسرامی کیسے اور کہاں پہنچ گئے۔

دراصل کامل سہسرامی کو جس ''نور'' کی تلاش تھی اسے پاکروہ آپے سے باہر ہوگئے اور صحیح معنوں میں واصل الی اللہ ہوگئے۔ اور علامہ بیضاوی کے اشاروں کا راز پالیا۔

اس موقع پر ایک بزرگ کا واقعہ انشراح کے لیے کافی ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ'الہ آباد' کے ایک بزرگ جو''دائرہ حجۃ اللہ'' کے سجّادہ، معتبر عالم، گہرے صوفی اور صافی بھی تھے۔ وہ حضرت خواجہ کے دربار میں ہر سال اپنی پوری ایک جماعت کے ساتھ اجمیر شریف حاضر ہوا کرتے تھے۔ موسیقی کے بہت شوقین تھے، اتنے کہ ان کے متعلق یہ کہنا بجا تھا کہ اگر ایک طرف کھانا رکھا ہو اور دوسری طرف موسیقی کی محفل سج جائے تو بھوک پر موسیقی کو ترجیح دیتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ حسبِ معمول دربارِ خواجہ میں حاضر ہوئے، رجب کی چھٹی تاریخ تھی۔ حضرت خواجہ کے دروازے کے سامنے جو چھٹی تاریخ کو خاص مجلس ہوتی ہے جس میں مخصوص لوگوں کی شرکت ہوتی ہے وہیں آپ بھی ایک کنارے بیٹھ گئے۔ قوال نے قوالی شروع کی اور فارسی کے کلام سنانے لگا۔ قوال جب اپنے گانے کے جوش میں سنانے لگا اور جب اس شعر پر پہنچا۔

خود بخود آزادی بودی
خود گرفتار آمدی

تو الہ آبادی بزرگ کو قید اور قید سے آزادی کا صحیح نقشہ سمجھ میں آنے لگا تو وہ اس کی تاب نہ لاکر وہیں واصل الی اللہ ہوگئے اور ان کا مزار شریف دربارِ خواجہ میں پچھم طرف آج بھی ہے۔ انہیں لوگ مولانا محمد حسین الہ آبادی کہتے تھے۔

کامل سہسرامی کے ساتھ کلکتہ میں پیش آنے والے حادثے کو ہارٹ فیل کہنا یہ ایک

ظاہری بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کامل سہسرامی نے حضرت مجاہدِ ملّت کی نورانیت کو اخذ کرنا شروع کیا تو کچھ دنوں تک سنبھال لے گئے مگر جب بات آگے بڑھی اور حضرت مجاہدِ ملّت کی نورانیت کے ذریعے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نورانیت کے وسیلے سے پروردگارِ عالم کی نورانیت سے جاملے۔ اور صحیح معنوں میں ''زادك بنورك'' کا جلوہ سامنے آیا تو نورِ حقیقی سے جاملے۔ مولانا کامل سہسرامی اگرچہ میرے شاگرد تھے مگر میں ان کی شاگردی پر فخر کرتا ہوں کہ ممکن ہے باری تعالیٰ ان کلمات کے ذریعے جس کو میں نے قلمبند کیا ہے میری مغفرت کا ذریعے بنادے۔ آمین ثم آمین بجاہ سیّد المرسلین۔

الکوثر، سہسرام شمارہ ۱۲ اپریل تا جون ۱۹۹۷ء

کامل سہسرامی

اظہارِ خیال

نہ جانے وہ کون سی ساعت تھی جب میں نے پاسبان کے لیے ''نجد سے سہارن پور تک'' کے نام سے پہلی مرتبہ مضمون بھیجا تھا۔ مضمون کے جواب میں مولانا کا حکم نامہ ملا کہ یہ پاسبان کا مستقل عنوان بنالیا گیا ہے اس کا نباہ تمہارے ذمہ ہے۔

ذہن وفکر کے کسی گوشے میں بھی اس بات کا وہم نہ تھا کہ میرے قلم کی یہ حماقتیں کسی وقت کتابی شکل اختیار کر سکتی ہیں۔

اس کی ذمہ داری اور جواب دہی سولہ آنہ علّامہ مشتاق احمد نظامی کے سر ہے کہ ان مضامین میں وہ کون سی بات تھی جس نے اسے کتابی شکل دینے پر آمادہ کیا۔

میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ مکر وریا کے مکروہ چہروں پر تقدس کی حسین نقاب ڈالے کچھ افرادِ ملّت کی شہ رگ کاٹنا چاہتے ہیں جن کی نقاب کشائی ضروری ہے اور میں نے یہی کیا ہے کہ اپنی حیات کا مقصد یہی ہے۔ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب رہا یہ مدیرِ پاسبان جانیں۔

کامل سہسرامی 25/ جولائی 1965ء

پاسبانِ ملت علامہ مشتاق احمد نظامی

محبت کے پھول

پاسبان کی علمی ودینی خدمات کا سکہ دنیائے سنیت میں آج بھی ایسے ہی کھنکھنا رہا ہے جس طرح آج سے پندرہ برس پیشتر! اگرچہ وہ ایک برس سے بالترتیب شائع نہیں ہو رہا ہے لیکن اس کی مانگ میں کوئی کمی نہیں ہے۔ میں نے برسوں پہلے جو چراغ روشن کیا تھا حوادثاتِ زمانہ سے اس کی لَو تو مدھم ہو گئی مگر جو روشنی پھیل چکی ہے اس کی تابانی نہیں گئی، یہ اس دور کی بات ہے کہ پاسبان سے کلیۃً میرا ذہن وابستہ تھا۔ ''نجد سے سہارن پور تک'' کے لیے میری نظرِ انتخاب فاضل جلیل مولانا محمد میاں کامل پر گئی اور مراسلات کا سلسلہ شروع ہو گیا، پہلے وہ ہچکچائے، لیکن کہنے سننے سے تیار ہو گئے۔ وہ تیار ہی نہیں ہوئے بلکہ ایسے مردِ میدان ثابت ہوئے گویا ایوانِ دیوبندیت کے لیے مدتوں سے پٹرول، بارود لیے بیٹھے ہیں صرف اس کا انتظار تھا کہ کوئی کہے کہ آتشگیر مصالحوں کو لے کر آگے بڑھیے۔ چنانچہ یہی ہوا پہلے ہی دھماکے میں پورا ملک گونج اٹھا، ہر طرف سے تحسین ومرحبا کی آواز بلند ہوئی۔

آخرش یہ ہوا کہ پاسبان کا دوسرا نام ''نجد سے سہارن پور تک'' پڑ گیا جس نے ایک بار پڑھ لیا ماہ بماہ بغیر پڑھے اسے چین نہیں۔ نجد سے سہارن پور تک سنجیدہ مزاح اور علمی و معلوماتی ظرافتوں کا حقیقت پسندانہ نچوڑ ہے۔ مولانا کامل اپنے اس طرزِ نگارش میں بالکل یگانہ ومنفرد ہیں۔ بات میں بات پیدا کرنا اور ہنستے بولتے ایسی دور رس باتیں کہہ جانا، جہاں خواص ہی کا ذہن جا سکے یہ ان کا خاص فن ہے یہ ایک خداداد صلاحیت ہے جس نے انہیں

دوسروں سے ممتاز کر دیا ہے۔

مولانا کامل۔ ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں! اپنے وقت کے بحر العلوم شیخِ طریقت حضرت مولانا فرخند علی علیہ الرحمۃ والرضوان کے خلف سعید ہیں جن کی علمی خدمات سے صوبۂ بہار آج بھی سدا بہار ہے۔ گوشے گوشے میں آپ کے تلامذہ ملک کی معیاری درسگاہوں میں مسندِ تدریس پر فائز ہیں۔

سہسرام! جو مولانا کامل کا وطنِ مالوف ہے وہ خود بھی گہوارۂ علم و ادب ہے، وہیں آپ نے آنکھ کھولی۔ الٰہ آباد، بریلی شریف، مبارک پور، احمد آباد کے مدارس میں درسِ نظامی کی تحصیل کی! اس وقت آپ صوبۂ بہار کی مرکزی درسگاہ مدرسہ خیریہ نظامیہ سہسرام کے نائب مہتمم ہیں۔ جب سے انتظام کی سربراہی ان کے ہاتھ آئی مدرسہ کو چار چاند لگ گئے۔

عصرِ حاضر کے شہرہ آفاق فلسفی حضرت مولانا ضیاء الحسن صاحب قبلہ کا مدرسہ خیریہ سے منسلک ہونا اس کے اعلیٰ معیار کی ضمانت ہے۔ پھر مسیح الملک حضرت مولانا حکیم مسیح الزماں صاحب جیسی بلند شخصیت کی سرپرستی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔

مدتوں سے قارئین پاسبان کی خواہش تھی کہ انہیں ایک جگہ جمع کر دیا جائے، آج ان کی خواہش کے مطابق ''نجد سے سہارن پور تک'' کا مجموعہ ان کی خدمت میں حاضر ہے۔

ہم پُرامید ہیں کہ یہ مجموعہ بھی کے پسندِ خاطر ہوگا۔

اور پڑھنے والے اسے ادارۂ پاسبان کی کامیاب کوشش تصور کریں گے۔ ربّ کریم مولانا کامل کو سلامت رکھے تاکہ وہ مدتوں خود بھی ہنستے رہیں اور دوسروں کو ہنساتے رہیں۔

آج کی دنیا میں ایسے لوگ بہت ہی کم یاب ہیں، غم بانٹنے والے بہت ہیں، مگر خوشی دینے والے نہیں، البتہ مولانا کامل اس سے مستثنیٰ ہیں۔ خدائے قدیر اس مجموعے کو شرف قبول سے نوازے، آمین بجاہ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

00000

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

جرمن کا فلسفی جھوٹ کہیں چاہے جو کچھ بھی کہا ہو لیکن صحرائے نجد کے ایک افلاطون قسم کے منطقی کا مقولہ ضرور سن لیجیے۔ اگر سماعت نازک ہوگئی ہو تو میرے راہِ راست پر آنے کی دعا کیجیے، لیکن سن ضرور لیجیے۔

''ہمیشہ اتنے بھیانک قسم کا سچ بولو کہ پوری انسانی آبادی چونک اٹھے اور دنیا کی ساری سچائی، ٹھوس واقعات، تاریخی صداقتیں خودکشی کر لیں۔''

اس مقولے سے متاثر ہو کر ایک تیس مار خاں نے اتنے عظیم الشان اور ہیبت ناک سچ کا انکشاف کیا کہ کائنات کی ساری صداقتوں کے چہرے سیاہ پڑ گئے ہیں۔

جی ہاں! ''خلافت معاویہ و یزید'' نامی کتاب سوفی صدی اسی مقولے کے زیرِ اثر لکھی گئی ہے۔ پوری کتاب میں بس شروع سے آخر تک سچ ہی سچ ہے۔ ہر صفحے میں کئی کئی من سچ ہے اور پوری کتاب میں پورے ساڑھے چوبیس ٹن سچ ہے۔

اس لیے ذرا سنبھل کر پڑھنے کی کوشش فرمایئے تو اچھا ہے ورنہ کہیں پڑھتے پڑھتے اس سچائی کے نیچے دب گئے تو پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر کسی پر اس کی ذمہ داری نہیں۔ میری بات کا یقین تو آپ کو آنہیں سکتا اور کسی حالت میں میری بات کو قابل اعتنا نہ سمجھیں گے، میرے ایک صداقت نواز کرم فرما کے بقول آپ کو یقین ہی کیوں آنے لگا۔ آپ نے ماں کے دودھ کے ساتھ یزید کی نفرت اور شہدائے کربلا کی عقیدت و محبت گھول کر پی ہے اور بچپن ہی سے یہ بات ذہن نشین کرادی گئی ہے کہ یزید ایک ظالم، غیر مستحق، بداعمال فرمانروا تھا اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس کے خلاف خروج ایک نہایت مقدس، بلند اور لائق صد تحسین اقدام تھا۔

اس لیے میرے اور آپ جیسے لوگ نہ تو اس سچ کی گہرائی تک پہنچے ہیں اور نہ ان شاء اللہ صبح قیامت تک پہنچ سکیں گے۔ ہم آپ سب والدین کی غلط تعلیم و تربیت کا نتیجہ ٹھہرے۔ ہاں! اس سلسلے میں سارے مسلم والدین گردن زدنی ضرور ہیں جنہوں نے اپنے بچوں کو الٹی پٹی پڑھائی اور صحیح حالات سے بے خبر رکھا۔ اگر حالات کی صحیح تصویر سامنے ہوتی تو کم از کم میں ضرور ذکرِ حسین کی بجائے منقبت یزید کو اپنے گلے کا تعویذ بنا ڈالتا۔ یہ نہ پوچھیے کہ توصیف یزید کس کلاس کے جہنم کا اعزازی ٹکٹ ہے۔ بلکہ امرو ہے کے ان بڑے میاں کے قدموں میں گر جایئے جنہوں نے اپنے فرزندار جمند محمود احمد عباسی کو حالات کی صحیح تصویر بتائی تھی، اور جن کی تعلیم کے نتیجے میں ان کا لختِ جگر تحقیق کے اکھاڑے کا دارا سنگھ بن گیا۔ اور یہ پانچ فٹ کے مدیر پاسبان اس دیو ہیکل سے فری اسٹائل کشتی لڑنے پر تلے ہوئے ہیں وہ بھی ایسا پہلوان جسے استاد عامر نے ریاض کرائی ہو، یقین کیجیے کہ ایک ہی گھونسے میں مدیر پاسبان کے دماغ کا گودا ناک کے راستے بہہ نکلے گا، لہٰذا باز رکھیں سارے قارئین پاسبان مدیر محترم کو اس دنگل میں اترنے سے! اور دعا کیجیے اپنے راہِ راست پر آنے کی اور اس حقیقت تک پہنچنے کی، اگر آپ نہیں پہنچ سکتے تو آئندہ نسل کو اس حقیقت تک پہنچانے کی کوشش ضرور کیجیے، یعنی ابھی سے اپنے بچوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیجیے کہ نواسۂ رسول باغی، جاہ پسند اور تخت و تاج کے بھوکے تھے اور اس کے ضمن میں حریص، لالچی، دنیا دار، خدا ناترس خود بخود آ جائیں گے، اور امیر المومنین یزید نہایت پاکباز، متقی، متبع سنت اور خلافت اسلامیہ کے نیر تاباں تھے۔

چنانچہ فتاویٰ رشیدیہ جلد بستم کے صفحہ چوبیس پر علامہ ترکستانی کی کتاب التحقیق کے حوالے سے درج ہے کہ کان الیزید صائما النہار وقائما اللیل و متقیا جدا والامثال لتقواہ وکان نجما لسماء الاسلام بل کان شمسا لظلام الدھور۔ ترجمہ: یزید صائم النہار، قائم اللیل اور بہت متقی شخص تھا۔ اس کے تقوے و پرہیز گاری کی مثال نہیں۔ وہ فلکِ اسلام کا تابندہ ستارہ بلکہ زمانے کی ظلمات کا سینہ چاک کر کے روشنی کی کرنیں بکھیرنے والا آفتاب تھا۔ اور صاحب کتاب نے بین السطور میں لکھا

ہے: وھو خلیفۃ من خلفاء اللہ۔

حضرت یزید کی اس مستند اور تاریخی منقبت کی روشنی میں آپ یزید کی عظمتوں کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ کے مذاقِ علمی کو شدید قسم کا زکام ہے۔

یزید کے نام کے ساتھ لفظ امیر المومنین اور سر کے اوپر رحمۃ اللہ علیہ دیکھ کر میری خارجیت پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے سے پہلے اتنا سن لیجیے کہ اس سچی کتاب سے لے کر تجلّی کے صفحات تک ہر جگہ میں نے اسی طرح لکھا دیکھا ہے اور حذف و اضافہ میرے بس کا روگ نہیں۔ تاہم اس کتاب میں ایک چیز کی کمی میں نے بری طرح محسوس کی، کاش! اس کے مصنف علّامہ محمود احمد عباسی اپنے پیر و مرشد کے ساتھ اپنے پیر بھائیوں کا سچا اور حقیقی تعارف کرا دیتے اور ان کی شخصیتوں پر جمی ہوئی گرد تحقیق و ریسرچ کے برش سے صاف کر دیتے، یعنی ابن زیاد، خولی، شمر ذی الجوشن وغیرہ کو بھی ساتھ ہی ساتھ بے گناہ، انصاف پسند، مجاہد ثابت کر دیتے تو کتاب از بسکہ جامع و مانع ہو جاتی، العیاذ باللہ۔

آپ کا جو جی چاہے کہیے لیکن یہ کتاب بڑے زور کی ہے۔ ''مدیر تجلّی'' کے الفاظ میں ''تو یہ کتاب ان کتابوں میں ہے جو صدیوں میں ایک آدھ ہی لائی جا سکتی ہے۔'' اور میرے خیال سے پورے تیرہ سو سال میں ایک اور صرف ایک ہی لکھی جا سکتی ہے، میری بات کا یقین نہ آئے تو مدیر تجلّی کا تبصرہ پڑھ لیجیے۔

''واقعہ یہ ہے کہ یزید اور ان کی حکومت کے بارے میں اتنا مسلسل جھوٹ بولا گیا ہے کہ لغو، لایعنی حکایتیں حقائق شمار ہونے لگیں۔''

یعنی یزید کی حکومت میں سولہ آنہ خیر تھی، اہل نبوت کے ساتھ اسے بڑی ہی عقیدت تھی، ہر ملاقات میں حضرت امام کی دست بوسی کیا کرتا تھا اور ایک مرتبہ تو مرید ہونے کی درخواست بھی کی تھی حضرت امام اور مسافرینِ کربلا کے ساتھ اس کے ظلم و ستم اور وحشت و بربریت کی جو داستان مدیر پاسبان ہر سال سنا کر ممبئی والوں کو رلاتے ہیں وہ سب کی سب محض لغو و لایعنی حکایتیں ہیں۔

اگراب بھی آپ نے انصاف، دیانت اور حقائق وشواہد کا گلا نہیں گھونٹا تو آگے سنیے:

"لامتناہی پروپیگنڈے نے یزید کی شخصیت کو جتنا بھیانک حضرت حسین کی شہادت کو حد درجہ مظلومانہ اور دیگر تفصیلات کو جس قدر ڈرامائی بنادیا ہے ان کو تعصب سے بلند ہو کر ٹھنڈے اور تحقیق پسند دل و دماغ سے اگر اس کتاب کا (خلافت معاویہ ویزید کا) مطالعہ کیا جائے تو چند جزئیات کے علاوہ من حیث المجموع اس سے اتفاق ہی کرنا ہوگا۔"

ماتم کیجیے اور ہو سکے تو سر دیواروں سے ٹکرایئے کہ اب تک آپ کس فریب میں مبتلا تھے اور ایمان لائے کہ "لامتناہی پروپیگنڈے نے حضرت حسین کی شہادت کو حد درجہ مظلومانہ بنا دیا ہے۔" کہیے کہ حضرت امام کی شہادت حد درجہ مظلومانہ نہیں بلکہ حد درجہ ظالمانہ تھی۔ اگر دل و دماغ اس پر آمادہ نہ ہوں تو انہیں سولی دے دیجیے یا سہارن پور سے دوسرا دل و دماغ منگوا کر فٹ کرا لیجیے اور اگلے کو نکال پھینکیے۔

اب اس کا جواب مدیر تجلّی کے ذمہ کہ شہادت ظالمانہ بھی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ میرے خیال میں ہمارے دیو بند شریف کے حدود میں ظلم و شہادت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور دونوں کی حیثیت سگی بہنوں سی ہے۔ حضرت شہید ملک یاغستان میں مسلمانوں پر ڈنڈا آزمانے پہنچ گئے، اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ محض دنیا کے لیے اپنے بھائیوں کے خون سے ہولی کھیلی جائے اور مارے جائیں تو شہید ہو جائیں، ظلم و شہادت کے گٹھ جوڑ کی ایسی نادر مثال اور کہاں مل سکتی ہے، ایک ظالم ترین انسان کو ہمارے کرم فرما شہید ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

اچھا حضور! ہم حضرت امام کو آپ کے بقول حد درجہ مظلوم نہیں سمجھتے بلکہ آپ ہی کی بات مانتے ہیں اور کم سے کمتر درجے کا مظلوم سمجھتے ہیں لیکن خدا کے لیے آپ بھی یزید کو اس درجے کا یعنی تھرڈ کلاس کا ظالم سمجھیے تو کچھ بات بنے۔

ایک قدم اور آگے۔

''تقدیر میں شہادت تھی! یہ شہادت ابتداءً تو ایک غم انگیز مقامی سانحے سے زیادہ نہیں تھی، لیکن دو ایک صدی بعد اہل حرص وہوس نے اس کو افسانہ بنا دیا۔''

ملاحظہ فرمایئے کہ شہادت کا اقرار ہے اور واللہ کہ یہ شہادت طاعون کے مرض میں نہیں، میدانِ کارزار میں، تلواروں کے سائے میں ملی ہے، جہاں ایک طرف وحشت وبربریت تھی، ظلم وستم تھا اور دوسری طرف صبر ورضا اور شکر وانابت تھی اور طرفہ یہ کہ شہادت کسی ہماشما کی نہیں بلکہ نواسۂ رسول اور جگر گوشۂ بتول کی ہے، ان تمام خصوصیات کے باوجود یہ شہادت آں بدولت کے نزدیک ''ایک مقامی سانحہ ہے۔''

جی ہاں! بالکل مقامی سانحہ، جس طرح آپ کے شہر میں کسی بھلے آدمی کا انتقال ایک مقامی سانحہ ہوتا ہے اسی طرح شہادتِ امام بھی۔ اس انکشافِ عظیم پر یزید بھی اپنی قبر میں پچھاڑیں کھا گیا ہو اور عالمِ وجد میں سارنگی بجانے لگا ہو تو کیا تعجب؟

اب ان عقل کے اندھوں سے کوئی پوچھے کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں، علم کے نام پر دیانت وانصاف کا خون کیوں کر رہے ہو؟

خانوادۂ نبوت کی دشمنی کی اور کیا انتہا ہوگی کہ تم نے تاریخی حقائق نہ صرف پسِ پشت ڈال دیئے بلکہ طبری، ابن اثیر اور سیوطی جیسے مؤرخین کو ''اندھیری رات میں لکڑیاں جمع کرنے والا بتایا'' اور شہادتِ کربلا کے عظیم حادثے کو محض ایک مقامی سانحہ۔

انگریزوں کے کاسہ لیس اور ایجنٹ اگر مارے جائیں تو آپ ان کو شہید ثابت کرنے میں پھیپھڑوں کی ساری قوت صرف کر دیں اور ان کی تاریخ مرتب کرنے کی دھن میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیں۔ ایک ظالم کی موت کو بین الاقوامی سانحہ قرار دیں اور تبصرہ نگاری کی مسند پر بیٹھ کر عقیدت مندی اور شخصیت پرستی کی دھن میں یہاں تک بک جائیں کہ ''سربکف، تیغ بکف وہ (اسماعیل دہلوی اور سیّد احمد رائے بریلوی) عزت کی اس وادی تک پہنچ گیا جس کے آگے کوئی وادی نہیں۔

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اس موڑ پر عقل وخرد کی ساری توانائی داغِ یتیمی دے کر اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ اور بقلمِ خود یتیم ویسیر بیچ چوراہے پر کھڑا چودھویں صدی کے ان عظیم محققین کی جان کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہا ہے، آپ حضرات بھی میری ہی طرح عقل کے یتیم ہو جائیں گے تو بات سمجھ میں آجائے گی اور اگر اس سعادت سے محروم رہ جایئے تو پھر سوچیے اور عامر عثمانی کی عقل پر فاتحہ پڑھیے۔

حق کی آواز بلند کرنے اور ایک غیر مستحق مدعیِ خلافت سے مسلمانوں کو نجات دلانے کی خاطر اپنی اولاد، اپنے گھر اور خود اپنی حیاتِ عزیز تک کو انہوں نے قربان کر دیا اور یہ آں بدولت کے نزدیک محض ایک مقامی سانحہ ٹھہرا۔ اور بنا بیتی شہداء عزت کے اس مقام تک پہنچ جائیں۔ ''جس کے آگے کوئی وادی نہیں'' ان کے شہید ایک جست میں عزت کی ساری حدوں کو پھلانگ گئے، صحابیت اور نبوت بھی اس کے پیچھے رہ گئی، کیونکہ جب اس کے آگے کوئی وادی ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ سب کے سب پیچھے ہی رہے، اور ان کے پیشواؤں کا ٹٹو سب سے آگے نکل گیا۔

شخصیت پرستی کی دھن میں انصاف و دیانت کی لاش پر نفسانیت کا عفریت جب برہنہ رقص کرتا ہے تو تاریخی حقائق اسی طرح مسخ ہوتے ہیں۔ ع

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

میں نے بھی اپنی کتاب ''تاریخِ صداقت'' میں نہایت عرق ریزی اور محنت و جانفشانی سے تاریخ کے بہت سے ایسے گوشوں کو اجاگر کیا ہے جن کے متعلق اب تک دنیا غلط فہمی میں مبتلا ہے اور دلائل و شواہد کی روشنی میں فرعون، ہامان، شداد، نمرود، مسیلمہ کذاب، ابوجہل اور ابولہب وغیرہ کا تقویٰ اور پرہیزگاری ثابت کی ہے۔ پھر تاریخ کا یہ انمول سرمایہ اب تک بازاروں میں بھی آجاتا لیکن اس راہ کا سب سے بڑا کانٹا مدیر پاسبان کی بریلویت ہے، خود چھاپنے کے لیے تیار نہیں اگر دوسرے اداروں سے ساز باز کرتا ہوں تو ایجی ٹیشن اور بائیکاٹ کی دھمکی ملتی ہے، یہی سبب ہے جواب تک مانع طباعت ہے۔

ناظرین اگر دباؤ ڈالیں تو ممکن ہے کہ یہ بریلوی اپنے ضد اور ہٹ دھرمی سے باز آجائے اور تاریخ کی یہ ٹھوس حقیقت شائع کرنے پر آمادہ ہوجائے، ویسے میرا ایمان ہے کہ آپ جیسے ہزار پانچ سو بھوک ہڑتال کر کے مر بھی جائیں جب بھی یہ بریلوی اپنی ضد سے ایک انچ نہ ہٹے گا۔

اصل میں بریلویت کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ عوامی تقاضوں اور وقت کے غلط مطالبوں کے آگے سر جھکانا نہیں جانتی۔ اس سلسلے کی آخر کوشش حضرت شیخ کے مزار کی چلّہ کشی ہوگی، کیا عجب کہ حضرت شیخ اس بریلوی کے ذہن وفکر میں انقلاب برپا کردیں۔

شاہا! چہ عجب گر بنوازند گدارا

00000

آپ کے یقین کرنے اور نہ کرنے سے میری اس عادت میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ٹرین میں سوار ہونے سے پہلے ہمیشہ اس بات کا اطمینان کرلیا کرتا ہوں کہ پورے ڈبے میں کانگریسی نما کھدر دھاری مولوی یا مولوی نما کانگریسی تونہیں۔

ملک کی برسرِ اقتدار اور حکمراں جماعت سے اس اظہارِ بیزاری پر آپ کا جی چاہے تو مہا سبھائی یا جن سنگھی جیسی سیاسی گالی دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتے ہیں لیکن میری یہ عادت ختم نہیں کر سکتے۔

کانگریس ملک کی کتنی ہی مقبول جماعت ہو، حکمرانی کی کیسی ہی صلاحیت رکھتی ہو لیکن یقین فرمایئے کہ جب کوئی لانبی داڑھی والا کھدر پوش ہو جاتا ہے تو پھر وہ نہ مولوی رہتا ہے نہ کانگریسی بلکہ دونوں کے درمیان کی چیز چھوٹو مداری (عرف چالباز شکاری) بن جاتا ہے جو اتنی مہارت و ہوشیاری سے جال ڈالتا ہے کہ غریب شکار کو پھڑ پھڑانے تک کا موقعہ نصیب نہیں ہوتا۔ بھانومتی کے پٹارے کا ایسا ایسا کرتب دکھائے گا کہ بس دیکھا کیجیے ہاتھ کی صفائی ایسی کہ کتنے مداریوں نے تو شرما کر اپنا کام دھندا چھوڑ دیا۔ چچا غالب نے اسی جماعت سے متاثر ہو کر تو کہا ہے۔

جب چاہا میرے یار نے انڈے کو بھینس کے
چشم زدن میں روغن زیتون کر دیا

اگر عقیدت مندیوں کے اظہار پر اتر آئے تو شیخ جی کو حضرت عبد اللہ ابن مبارک اور سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کا مقتدا بنا کر تالیاں بجائے، پیر جی کو صدیق، فاروق، متاع الکل مربی خلائق ثابت کر دے۔

دشمنی پر اتر آئے تو کائنات کی افضل ومقدس ترین ذات کو گاؤں کا چودھری بنا ڈالے، خدائی کے ساتھ ساتھ خدا پر بھی ہاتھ صاف کرنے میں نہ چوکے۔ فتوے بازیوں پر اتر آئے تو نذر و نیاز، فاتحہ وزیارت ہر چیز کو نہ صرف حرام ثابت کردے بلکہ شرک کے موٹے موٹے کیڑے بھی نکال دے۔ یہ اور بات ہے کہ اسی کے فتوؤں کا مارا کھانا اگر خوش قسمتی سے اسے مل جائے تو اس طرح ہضم کر لے کہ ڈکار بھی نہ لے، سیّد مسعود سالار غازی کے مزار شریف کی سات گز لمبی چادر اوڑھ لے اور شرک کی آلودگیوں سے پاک بھی رہے، حلال کرنے پر آئے تو کوّا حلال کر دے، کپورہ حلال کر دے، یہاں تک کہ دین وملّت بھی حلال کر ڈالے۔ آپ نے نہیں سنا کہ ایک غریب شکاری نے جنگل میں جال ڈالا ایک کبوتر کے ساتھ ہی ایک بدنصیب چیل بھی آ پھنسی، شکاری اپنے دونوں شکار کو لیے مکان کی طرف چل پڑا، راستے میں اس کا ایک کھدر دھاری شناسا مل گیا، علیک سلیک کے بعد دونوں اس طرح آگے بڑھے کہ جال شکاری کے ہاتھ میں اور شکار مولوی کھدر کے ہاتھ میں۔

کبوتر تو سمجھ چکا تھا کہ اب اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں اور کوئی خریدار ذبح کر ہی ڈالے گا، وہ غریب مولوی کے ہاتھ میں خاموش راضی برضا لٹکا ہوا تھا لیکن چیل فرطِ غم سے رو رہی تھی کبوتر نے اس طرح زار و قطار روتے دیکھ کر پوچھا ''بی چیل! رونا تو مجھے چاہیے کہ میں چند گھڑی کا مہمان ہوں لیکن تمہارے اس طرح رونے کا سبب کیا ہے تم تو مسلمانوں کی شریعت میں حرام ہو تمہیں کا ہے کا غم!

چیل نے کہا، میاں کبوتر جب تک شکاری کے ہاتھ میں تھی مطمئن تھی لیکن اب اس لیے رو رہی ہوں کہ بد قسمتی نے ایک مولوی کے ہاتھ میں پہنچا دیا ہے جو حرام کو حلال بنانے کے فن میں پوری مہارت رکھتا ہے۔

آمدم برسرِ مطلب کہ میں ہمیشہ سفر کرتے وقت چھوٹو مداری کے سلسلے میں مکمل اطمینان کر کے ہی ڈبے میں بیٹھنے کی جسارت کرتا ہوں۔ شامتِ اعمال سے پچھلے ہفتے ایسے وقت اسٹیشن پہنچا کہ گاڑی نے پلیٹ فارم پر رینگنا شروع کر دیا تھا، ٹکٹ لیے بغیر دوڑا اور سامنے

والے ڈبے میں گھس گیا، ایک ذرا سانس کی درستگی کے بعد اِدھر اُدھر دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک بائیں طرف سے ''بھائی! بھائی! کی آواز آئی، مڑ کر جو دیکھا تو ایک دم دماغ بھک سے اڑ گیا، اور دل کی رفتار ٹرین کی رفتار سے آگے نکل جانے کی کوشش میں مصروف ہوگئی۔

سیٹ کے آخری حصے پر اسی جماعت کے ایک مہاشے براجمان تھے جن کے متعلق میں نے ہمیشہ محتاط رہنے کی کوشش کی ہے، اب محسوس ہوا کہ ٹرین چھوڑ دینا کتنا سستا اور چلتی ٹرین میں سوار ہونا کتنا مہنگا ہوتا ہے، وہ تو کہیے کہ بچوں کی یتیمی کا بھیانک تصور دیوار بن کر حائل ہوگیا ورنہ ایک ہی چھلانگ میں اس وحشت ناک راہ کی ساری منزلیں طے کر لیتا، اور ادھر مدیر پاسبان سیاہ لکیروں والا اداریہ چھاپ کر مجھ سے فرصت حاصل کر لیتے۔

''ادھر بیٹھ جایئے'' خیالات میں اچانک بریک لگی۔

ایک کتاب مولوی صاحب کے ہاتھ میں اور بہت ساری کتابیں سیٹ پر اس طرح بکھری ہوئی تھیں جیسے اے، ایچ، وہیلر نے اسٹیشنوں کے علاوہ گاڑیوں میں بھی اپنا بک اسٹال لگانا شروع کر دیا ہو۔

''آیئے آیئے!'' میرے بڑھتے ہوئے قدم دیکھ کر صوفی نما بزرگ نے ایک ہاتھ سے سیٹ تھپتھپاتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے کتابیں ایک طرف سمیٹتے ہوئے کہا۔ ساری سیٹیں انگیج تھیں، قہر درویش برجان درویش چار و ناچار بیٹھ گیا۔

علیک سلیک کے بعد میں نے ہی سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے دریافت کیا'' غالباً آپ حضرات کا تبلیغی جماعت سے گہرا ربط و تعلق ہے۔'' بکھرے ہوئے لٹریچر تعارف کے لیے کافی تھے۔

''جی ہاں! ہم لوگ دہلی کے اجتماع میں شرکت کے بعد ممبئی واپس جا رہے ہیں۔ ماشاء اللہ! مجھ ناچیز کو بھی اپنا پیر بھائی سمجھیے۔

''یعنی؟ یعنی کہ میں بھی مرشدِ برحق لاریب و شک حضرت مولانا الیاس صاحب کا خادمِ بے دام اور آستانے کا جاروب کش ہوں۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر، اے صوفی تبارک! ان سے ملو، یہ بھی ہمارے پیر بھائی ہیں۔'' انہوں نے صوفی جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، جواب تک مطالعے میں مجسم غرق تھے، مجسم اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آنکھوں کے ساتھ ہاتھوں کی انگلیاں اس طرح چل رہی تھیں جیسے انگلیاں بھی مصروفِ مطالعہ ہوں۔

''اچھا!'' صوفی جی نے الف پر کئی مد لگاتے ہوئے کہا۔ ''صاحب خوش بخت ہیں وہ لوگ جنہیں میاں کا دامن نصیب ہوگیا اور تبلیغ کے مقدس فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔'' ''کہاں جارہے ہیں؟'' صوفی جی نے دریافت کیا۔

''اب ظاہر ہے کہ میں سچ سچ بتادیتا تو ان کے کرم کی محرومی کے ساتھ ساتھ اپنا بھرم بھی جاتا رہتا۔

''میں تو جارہا تھا گیارہویں شریف کی ایک تقریب میں میلاد پڑھنے لیکن چھٹی کے عرس کی بات زبان پر آگئی۔ اسماعیل آزاد کو حضرت مرشد کے عرس شریف میں شرکت کے لیے بلانے جارہا ہوں۔'' میں نے انتہائی سعادت مندی سے عرض کیا۔

''ہائیں! کیا کہا حضرت مرشد برحق کا عرس؟'' مولوی صاحب نے سرخ آنکھوں سے پوچھا۔

''کہاں حضرت مولانا الیاس صاحب کی ذاتِ گرامی اور کہاں عرس کی گندگی معاذ اللہ'' صوفی جی نے گرہ لگائی۔

''جی ہاں! حضرت بالکل! حضرت پیر و مرشد کا عرس'' یہ میرا دوسرا سعادت مندانہ جواب تھا۔

''میاں! کیوں بکواس کرتے ہو، تم نے حضرت کی ذات کو سمجھا ہی نہیں، میاں! برسوں خدمت میں رہ چکا ہوں۔ حضرت کی پوری زندگی عرس جیسی بدعتوں کے خلاف جہاد فرماتے گزری ہے، تمہیں شرم آنی چاہیے کہ اپنی نسبت اس بزرگ کی طرف کرتے ہو جس کے یہاں اس قسم کی بدعتوں کا گزر تک نہ تھا اور تم اتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کرنے چلے ہو، لاحول ولا قوۃ۔''

''جناب اس میں شرم کی کیا بات ہے، ہمارے علاقے کے تمام پیر بھائیوں میں بے انتہا جوش ولولہ ہے اور سب کا اتفاق ہے کہ حضرت کا عرس اور قوالی ضروری ہے چنانچہ چندے کا کام زور وشور سے شروع ہو چکا ہے، اور آئندہ چاند کی سترہویں تاریخ مقرر بھی ہو چکی ہے، میری تو گزارش ہے کہ موقع ہو تو آپ لوگ بھی ضرور شرکت کریں۔''

''لعنت ہے تمہاری شرکت پر، کمبخت نالائق،'' صوفی جی اس طرح دہاڑے کہ ہم نے یقین کر لیا کہ اب گال سہلانے کی باری بھی جلد از جلد آیا ہی چاہتی ہے۔

''ارے صاحب! میں اس بدعت کو اپنے مرشد کے نام پر کبھی نہ ہونے دوں گا۔'' مولوی صاحب نے بھی طیش کا مظاہرہ فرمایا۔

''عرس ہوگا اور ضرور ہوگا، یہاں کے مریدین میں آپ سے زیادہ جوش ہے۔'' میں نے بھی ذرا تیور بدل کر جواب دیا۔

''جوش کی ایسی کی تیسی، میں پورے ملک کے علما سے اس کے خلاف فتوے لے لوں گا اور ضرورت ہوئی تو انہیں بلا کر اس عرس کا رد بھی کراؤں گا، غضب خدا کا اتنا بڑا ظلم اور میرے پیر کے ساتھ۔'' مارے غصے کے مولوی صاحب کی ناک کے دونوں نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے۔

''سنیے جناب! بظاہر یہ بات غصہ ہونے کی ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ حالات کو سمجھے اور پس منظر کو جانے بغیر آپ حضرات اس طرح برس پڑے۔''

''اچھا تو بدعتوں کے بھی پس منظر ہوا کرتے ہیں۔'' صوفی جی نے میرا منہ چڑھایا۔

''جی ہاں قبلہ! اس کا بھی پس منظر ہے اور یہ مقدس عرس اپنی پشت پر نہ صرف جواز بلکہ باعثِ ثواب ہونے کا اتنا ٹھوس ثبوت رکھتا ہے کہ آپ بھی تائید پر بہر حال مجبور ہوں گے۔''

''آپ ہی حضرات کی طرح میں بھی عرس وغیرہ کو بدترین معصیت سمجھتا تھا اور اس کا حد درجہ مخالف تھا لیکن جب سے حضرت صاحب کی طرف سے بشارت ہوئی ہے ہمیں اپنا خیال بدلنا پڑا۔'' میں نے اس چکار کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ بات یوں ہے کہ ایک شب میں نے خواب میں دیکھا کہ سارے جنتی ایک بہت ہی خوشنما باغ میں بیٹھے ہوئے ہیں، ہر شخص کے

سامنے مجلسِ سماع ہو رہی ہے، پوری محفل پر وجد و سرور کی کیفیت طاری ہے اور حضرت ایک مرصع تخت پر تشریف فرما ہیں۔ حور و غلماں اور خدام ہر قسم کی خدمت کو مؤدب کھڑے ہیں، اس امتیازی عظمت کے باوجود حضرت جمائی پر جمائی لے رہے ہیں، جب جمائیوں کا سلسلہ زیادہ ہوتا ہے تو زمرد کی ڈبیے سے چٹکی بھر نسوار لے کر سونگھ لیتے ہیں اور چھینک کر تازہ دماغ ہونے کی کوشش فرماتے ہیں، یہ عمل بہت دیر تک جاری رہا کہ اچانک حضرت کی نظر مجھ پر پڑی، دیکھتے ہی گرج کر فرمایا جا میرا عرس اور قوالی کر ورنہ بھسم ہو جائے گا۔''

''واقعی؟'' صوفی جی کا انداز اب کافی نارمل تھا۔

''سوفی صدی، واقعی!''

''ارے تم بھی کس چکر میں پڑ گئے۔'' صوفی جی نے کہا۔ ''حضرت کے ساتھ اس قسم کی لغویات کی نسبت بھی گناہ سمجھو۔ میاں! یہ شیطانی وسوسہ ہے، ان خیالات سے توبہ کر کے تصور شیخ کا عمل کرو اس بدعت کے دلدل سے خود بخود نکل جاؤ گے۔''

''واہ مولوی صاحب واہ! حضرت صاحب بشارت دیں اور آپ اسے شیطانی وسوسہ بتائیں جس نے حضرت کی ملفوظ نہ دیکھی ہو، وہی اسے وسوسہ کہہ سکتا ہے، مولوی صاحب اب آپ پر توبہ واستغفار لازم ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ حضرت نے ملفوظات کے صفحہ نمبر 56 پر تحریر فرمایا ہے کہ ''شیطان ملعون اگر مجھ فقیر کی شکل اختیار کرنے کی ذرہ برابر بھی کوشش کرے گا تو جل مرے گا۔ اور جب خواب میں حضرت کو دیکھا تو ظاہر ہے کہ بہ نفسِ نفیس ہی تشریف لائے ہوں گے، اب اس یقین کے بعد ہم جیسے عقیدت مندوں کے لیے چوں چرا کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے۔'' چڑھے چہروں کا اتار دیکھ کر میں نے ترپ بھی چل دیا۔

''مولویوں کے فتووں سے ڈر لگتا ہے اگر خدانخواستہ میرے خلاف فتوے بازیاں شروع ہو گئیں تو بڑا برا ہوگا، پھر کتابوں میں عرس کو حرام لکھا ہے۔ یہ مرحلہ کس طرح طے ہوگا سمجھ میں نہیں آتا۔''

جواب میں کافی طویل خاموشی کے بعد صوفی جی بولے۔ ''ہاں بھائی آپ کی اس بشارت کے بعد میرا بھی جی چاہتا ہے کہ شرکت کروں لیکن۔۔۔ وہ درمیان ہی میں گول ہو گئے۔

"کتابوں کی تحریر اور مولوی کا فتویٰ!" میں نے جملہ پورا کر دیا۔

"بھائی تم نے بڑی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں ویسے کتابوں کے متعلق مجھے تشویش نہیں، جس کا جو جی چاہا لکھ گیا ہے وقت کے تقاضوں کے ماتحت فتوے بھی تو بدلتے رہتے ہیں، پھر حضرت جی کی بشارت کے بعد ان کتابوں کی حقیقت ہی کیا ہے۔" مولوی صاحب نے بڑے سنجیدہ انداز میں کہا۔

"قبلہ آپ کا فرمانا بجا ہے اور واقعی وقت کے تقاضوں سے فتوے بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن ان سنّیوں کے ڈنڈے کا کیا علاج ہے۔"

"اس کے متعلق بھی تم فکر نہ کرو، میں سب کی دکھتی رگ پہچانتا ہوں، کم و بیش سبھی سے نپٹ لوں گا یوں کوئی نہ مانے تو روپے کی طاقت سے بڑے بڑوں کو منایا جا سکتا ہے۔"

"کوئی اس پر راضی نہ ہوا تو!"

"ارے میاں، وہ کیا ان کے باپ کو ماننا ہوگا، کون ہے جس کی اخلاقی کمزوری سے بندہ واقف نہیں، زہد و پارسائی کے نیچے ریاکاریوں اور اخلاقی بیماریوں کی کیسی کیسی بستیاں آباد ہیں تمہیں کیا معلوم ہے۔" مولوی صاحب جذبات کی رَو میں پورے یقین کے ساتھ بول رہے تھے۔

"لیکن میاں بات صاف صاف سن لو منھ بند کرنا میرا کام ہے لیکن روپیوں کا انتظام تمہارے ذمے ہوگا۔"

روپیوں کے متعلق آپ بالکل فکر مند نہ ہوں اس لیے کہ۔" اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

"کہو کہو! اپنوں سے کاہے کا پردہ۔" میرے تذبذب کو دیکھ کر بولے۔

"آپ پیر بھائی ہیں اور میرے لیے سگے بھائیوں سے بھی زیادہ عزیز اور واجب الاحترام ہیں، اس لیے عرض کیے دیتا ہوں ورنہ کسی حالت میں بھی یہ بات کسی سے کہنے کے لائق نہیں۔"

"اصل میں حضرت جی کی اس بشارت کے بعد میں نے وزیر اعظم روس مسٹر خروشچوف

کو ایک تہدیدی خط لکھا کہ تم بالکل ملحد اور ناستک ہو گئے ہو۔ خدا کو تو چھوڑا ہی تھا، حضرت جی کو بھی چھوڑ دیا جو تمہاری کامیابیوں کی ضمانت تھے۔ اگر اقتدار کا سکہ سارے عالم میں جمانا ہے تو میرے مرشد کے عقیدت مند ہو جاؤ اور نہیں تو سمجھ لو کہ نہ تمہارا یہ راکٹ کامیاب ہوگا اور نہ تم چاند کی سرزمین پر قبضہ کر سکو گے۔ اگر کامیابی چاہتے ہو تو حضرت جی کے عرس میں سراپا عقیدت بن کر شرکت کرو۔ قدمے نہیں، تو دامے، درمے شرکت ضروری ہے۔ حضرت خوش ہو گئے تو تمہارا اکلیان ہو جائے گا اور چشم زدن میں مملکتِ آسمان کے بادشاہ بن جاؤ گے۔''

''اچھا تو پھر خروشچوف نے کیا جواب دیا؟'' مولوی صاحب نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

''اس نے جواب میں لکھا تھا کہ آپ خواہ مخواہ مجھ سے بدظن ہو رہے ہیں میں بظاہر ناستک ہوں لیکن دل و جان سے حضرت کا فدائی ہوں، یہ اشتراکیت اور کمیونزم کا گورکھ دھندا جو میں نے پھیلا رکھا ہے وہ بھی حضرت ہی کے تبلیغی مشن کا ایک جز ہے، ملکوں کے فرق سے تبلیغ کا انداز بدلا ہوا ہے، دور سے یہ بالکل دہریت معلوم ہوتی ہے لیکن قریب سے دیکھنے والوں کو حضرت جی کی تعلیم کا حصہ سمجھ میں آتا ہے ہر موڑ پر حضرت جی ہی سے مدد کا طالب ہوتا ہوں اور وہی میری مدد فرماتے ہیں، آپ حضرت جی کا عرس مبارک کر رہے ہیں، اس سے بڑی مسرت ہوئی، جسمانی سفر سے مجبور ہوں، میری روح بہر حال شریکِ عرس رہے گی سرِ دست چوبیس ہزار ڈالرز روانہ کر رہا ہوں، حضرت جی کا عرس پورے تزک و احتشام سے ہونا چاہیے، اگر کچھ کمی ہو تو اور ڈالرز منگا لیجیے اور ساتھ ہی ساتھ میری کامیابی کے لیے دعا کیجیے گا اگر کامیاب ہو گیا پہنچنے میں چاند کی سرزمین پر اور قبضہ ہو گیا آسمان پر تو البتہ کراؤں گا عرس سالانہ حضرت مرشد کا اندر اہتمام اپنے کے اور الاٹ کروں گا واسطے حضرت جی کے بلڈنگ پوری ایک عدد ایئر کنڈیشنڈ، خلفا کو عمدہ فلیٹ اور عام مریدین کو کھولی ایک ایک عدد۔''

''واقعی خروشچوف نے سارے مریدین کو ایک ایک کھولی دینے کا وعدہ کیا ہے۔'' پوچھتے وقت مولوی صاحب کی آنکھوں میں عجیب چمک تھی۔

''بالکل واقعی، جناب کیا میں آپ حضرات سے مذاق کر رہا ہوں۔ آپ لوگ بھی خروشچوف بھائی کی کامیابی کی دعا کریں میں تو آٹھوں پہر دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ..

تیر نشانے پر بھرپور بیٹھا تھا، میں نے جھٹ ایک لفافہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''اگر یقین نہ ہو تو مسٹر خروشچوف کا خط۔۔۔''

''نہیں نہیں مجھے آپ پر اعتبار ہے، میں تو اب یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر بھائی خروشچوف نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تو بخدا زندگی کے دن پھر جائیں گے اور سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔''

''بس آپ حضرات کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔''

''وہ تو میں نے ابھی سے شروع کر دی ہے، لیکن یار ہم لوگوں کو بھولنا مت، میں تو حضرت جی کا خلیفہ بھی ہوں لہٰذا میرے لیے ذرا اچھے قسم کے فلیٹ کی سفارش کرنا۔''

''آپ اسماعیل آزاد کو عرس کی دعوت دینے جا رہے ہیں؟'' صوفی جی نے مولوی صاحب کی بات کاٹ دی۔

''نہیں اب یہ کام آپ حضرات کے ذمہ سونپتا ہوں۔ میں اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں گا۔''

''کوئی بات نہیں! میں سارے معاملات طے کر لوں گا۔ آپ کو اختیار ہے جسے چاہیں بلائیں لیکن جانی بابو، اسماعیل آزاد سے اچھا گاتا ہے، میں نے حاجی ملنگ کے عرس میں اس کا گانا سنا تھا۔''

''اگر میری مانو تو چلبلی جان جھانسی والی کو بلا لو پھر دیکھو محفل کیسی جمتی ہے، میں نے اس کو، پچھلے پیر کی چھٹی پر سنا تھا۔ کیا سوز ہے ظالم کی آواز میں، ظالم کی ادائیں تو ایسی قاتل ہیں کہ بے ساختہ قربان ہونے کو جی چاہنے لگتا ہے اور میاں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ صورت بالکل حضرت جی جیسی!''

''آپ کا اسم شریف تو میں نے پوچھا ہی نہیں'' ڈائری کھولتے ہوئے میں نے دخل در

معقولات کر دیا کیونکہ میرا اسٹیشن قریب آچکا تھا۔

''ناچیز کو مولوی نغمۃ الیقین کہتے ہیں!''

''آپ کا؟'' میں نے ان کا نام لکھتے ہوئے صوفی جی کی طرف اشارہ کیا۔

''فقیر کا نام صوفی کشف المحجوب ہے!''

''اور ان کا؟'' سوئے ہوئے تیسرے جوگی کے بارے میں دریافت کیا۔

''چھوڑیے صاحب! اس گدھے کو، اچھا ہے کہ سویا ہوا ہے ورنہ مسٹر خروشچوف کی عقیدت مندیوں کا حال سن کر الگ خط و کتابت شروع کر دیتا، بڑا ہی خبیث ہے، پچھلے سال جماعت کے نام پر جو کچھ چندہ کیا سب تنہا کھا گیا، دیکھتے نہیں صورت پر کیسی پھٹکار برس رہی ہے۔''

اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکتے ہی میں یہ کہتا ہوا اتر گیا کہ ''اپنی پسند کا قوال لے کر ستر ہویں کو ضرور آجائیے۔''

لیکن اب سوچتا ہوں کہ اگر ستر ہویں کو آ گئے تو....؟''

□□□

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

آپ نے نقاب پوش لٹیرے کا نام سنا ہوگا جو سیٹھ رستم جی دارو والا کی تجوری سے پچھتر ہزار روپے نکال کر چلتا بنا اور سیٹھ جی ایک مجبور تماشائی کی طرح دیکھتے رہے اور سیاہ پوش ڈاکو کی کہانی بھی پڑھی ہوگی جس نے بڑی بڑی ریاستوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔

ٹھیک ایسے ہی ہمارے بھارت ورش کے مقدس علما ہیں جو کھدر پہن لینے کے بعد نقاب پوش لٹیرے سے ایک انچ کم نہیں رہتے۔ مدیر پاسبان، ملّت کی پاسبانی میں ہزار ڈنڈے گھمائیں یہ بہر حال اپنا کام کر ہی جاتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ہاتھ کی صفائی دکھانے کے لیے ان بیچاروں کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

غریب پائجامہ چڑھائے بدعت کا ردّ کرتے پھر رہے ہیں اور ہم بریلویوں کے پیچھے اس طرح مسلح لشکر کشی کر رہے ہیں کہ چینی جارحیت بھی شرم سے پسینہ پسینہ ہے، خود ساختہ توحید کے پٹارے کو انتہائی کمال سے سجا بنا کر سارا دن سر پر لیے لیے پھرتے ہیں اور بھولے راہ گیر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

''بھائی لو! نہ سہی سب، کچھ تو لے لو!''

اتنا بھاری بوجھ لادے لادے کمر دوہری ہوگئی ہے، خدا کے لیے کچھ بوجھ ہلکا کر دو۔''
لیکن خدا جانے کیا بات ہے کہ کوئی شخص تولہ بھر توحید بھی لینے کو تیار نہیں ہوتا۔ اوّل تو لوگ پائجامے کی اونچائی اور ٹریڈ مارک دیکھ کر ہی وحشت میں بھاگنے کا راستہ تلاش کرتے ہیں، اور اگر کوئی آفت کا مارا ادھر آ بھی گیا تو فوراً ناک دبا کر چلاتے ہوئے بھاگتا ہے، توبہ توبہ توحید کے اس حسین پٹارے سے توہین رسول کی سڑاندھ آرہی ہے۔ کسی کو محبت اہل بیت نبوت کی خوشبو

نہیں محسوس ہوتی، اہانتِ غوث کی بدبو سے کسی کی ناک پھٹتی محسوس ہوتی ہے، کسی کو خواجہ کی عقیدت کی دلنواز خوشبو سے محرومی پریشان کرتی ہے، غرضیکہ جتنی ناکیں اتنی باتیں۔

لیکن صاحب! پیٹھ ٹھونکیے ہمارے علمائے بھارتیہ کی اور داد دیجیے ان کے نتھنوں کی کہ لنگر لنگوٹ کسے میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں، کوئی گلا پھاڑ رہا ہے، کوئی قلم گھس رہا ہے، کوئی بوریا بستر دبائے ستو باندھے گاؤں گاؤں کلمے کی تلقین کر رہا ہے۔

کل بیچارے مولانا توکل علی اللہ کا چیختے چیختے گلا سوکھ گیا، حلق میں کانٹے پڑ گئے سنگترے کا پورے آدھ سیر رس پیا تو اک ذرا جان میں جان آئی اور سوکھا حلق تر ہوا۔ وہ تو کہیے غریب کی تحویل میں جماعت کے نام پر کٹے ہوئے چندے کی رقم تھی جو آڑے وقت کام آگئی ورنہ بیچارے کا دم ہی نکل جاتا۔

نہ جانے کتنوں کے قلم شہید ہوگئے، مولوی نصیر الدین رشیدی ثم الحسینی کی صرف پانچ مہینوں میں تین درجن نبیں گھس گئیں جب کہ مرکز سے پورے سال بھر کے لیے صرف دو ہی درجن نبیں ملا کرتی ہیں۔

کل رات مولانا فناء التوحید بقائی مکی ثم المدنی ثم البھارتی پر بھی جذبہ صادقہ طاری ہوا، اور بدعت کی تردید کا دورہ پڑنے لگا تو آپ نے بھی اشہبِ قلم کی لگام ڈھیلی کر کے چھوڑ دیا اور جب قلم گھستے گھستے تھک گیا تو ذرا دم لینے کو لیٹ گئے، بدقسمتی سے آنکھ لگی تو پھر صبح ہی کو کھلی۔ چوہوں نے میدان خالی پاکر دوات پر شیروں کی طرح حملہ کر دیا ساری روشنائی صاف کرنے کے بعد اندر کا پڑا ہوا کپڑا نکال کر چوس ہی رہے تھے کہ شاید مولانا نے کروٹ بدلی بہادر چوہوں نے گھبراہٹ میں کپڑا لیے دیے بھاگ جانے کی کوشش کی، لیکن جست لگاتے وقت مولانا کی نورٌ علیٰ نور ریش مقدس آڑے آگئی اور روشنائی بھرا کپڑا داڑھی سے الجھ کر رہ گیا، صبح کی نماز کے بعد جب لوگوں نے مولانا کی زیارت کی تو سجدے ہی میں ہنسنا شروع کر دیا میں نے جو اِدھر اُدھر متجسس نظریں ڈالیں تو دیکھا کہ مولانا کی سفید دودھیا داڑھی پر پورے چار انگل سیاہی پتی ہوئی ہے۔

مولانا لوگوں کی اس بے ساختہ قسم کی ہنسی کا سبب نہیں سمجھ پا رہے تھے تاہم چہرے کا اتار چڑھاؤ بتا رہا تھا کہ مولانا انتہائی بیزار ہیں اور اسی سبب سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن آخر کب تک؟ جی کڑا کر کے پوچھ ہی لیا۔ ''مولانا یہ کیا ہے؟''

''کیا بات ہے؟'' وہ اپنی مخصوص رعب والی آواز میں بولے۔

میری وضاحت سے پہلے ہی ایک صاحب نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا ''معلوم ہوتا ہے رات خضاب لگاتے وقت کوئی بہت ضروری کام آن پڑا ہے اور اس کی تکمیل کی دھن میں خضاب غیر مکمل رہ گیا۔''

''کون مردود داڑھی میں خضاب لگاتا ہے؟'' مولانا حلق کے بل چیخے۔

دوسرے مسخرے نے گرہ لگائی ''مولانا داڑھی دل کا آئینہ بن گئی ہے!''

مولانا غصے سے بے قابو ہو کر موٹی سی گالی ہی دینے والے تھے کہ میں نے جلدی سے سوال کر ڈالا، داڑھی کے بیچ میں سیاہی کیسی ہے؟''

''ہائیں! سیاہی؟''

وہ سوچتے رہے، کبھی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر ہاتھ کو دیکھتے، کبھی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ لے جا کر بالوں کو اوپر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کرتے، کافی دیر تک غور کرنے کے بعد ہنسی کی پھلجڑی چھوٹی۔ ''ارے یار! رات اپنی کتاب ''نصیر التوحید'' کا مسودہ لکھتے لکھتے سو گیا اور دوات بند کرنا بھول گیا، معلوم ہوتا ہے کہ یہ چوہوں کی خباثت ہے، نہ معلوم کہاں سے آجاتے ہیں چادر پر بھی کچھ سیاہ دھبے معلوم ہو رہے تھے۔''

ایک حساب داں سے نہ رہا گیا اور بول پڑے ''مولانا آپ اور چوہا اگرچہ جدا جدا ہیں لیکن دونوں کے عدد تو ایک ہی ہیں۔ یعنی نمبر چوبیس، معلوم ہوتا ہے کہ چوہا بھی اخوت واتحادِ باہمی کے فلسفے سے واقف تھا، بیچارے نے آپ کی ہمدردی میں صرف شوربے پر اکتفا کیا اور بوٹی آپ کی طرف ڈال دی، یہ دوسری بات ہے کہ منہ میں جانے کی بجائے داڑھی سے الجھ کے رہ گئی لہٰذا چوہے کو گالیاں دینے کی بجائے دعائیں دیجیے دعائیں!''

میں نے تو کھسک جانے ہی میں عافیت سمجھی اس لیے بعد کی باتوں کا علم نہیں، البتہ آپ سوچیے کہ ہمارے مولوی فناء التوحید نے جوابی جملے میں کیا کچھ نہ سنایا ہوگا۔

لیکن ٹھہریئے! آپ سوچنا شروع کردیں گے تو میری بات کون سنے گا اس لیے۔ تو میں عرض کررہا تھا کہ ہمارے علماء بھارتیہ کھدر لپیٹے، دن رات ہم بریلویوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، دوسری طرف ہمارے کرم فرما جو کچھ نہ کچھ شگوفے چھوڑتے ہی رہتے ہیں۔

حیدرآباد کے ایک محترم نے اپنی کتاب ''صلوٰۃ الغوثیہ'' کے زیرِ عنوان لکھ دیا کہ اگر تمہیں کوئی مشکل مرحلہ پیش آئے تو دو رکعت نفل پڑھ کر گیارہ قدم بغداد کی طرف چلو، پھر یہ دعا پڑھو، یَاعُبَیْدَ اللهِ بِاِذْنِ اللهِ وَیَاشَیْخَ الثَّقَلَیْنِ اَغِثْنِی فِیْ قَضَاءِ حَوَائِجِی۔

اب بھلا بتایئے یہ شگوفہ نہیں تو کیا ہے؟ آخر یہ کیا تک ہے کہ آپ رہیں تو بھارت میں اور استمداد کے لیے گیارہ قدم اس ملک کی طرف چلیں جہاں کے صدر کی زندگی بھی خطرے سے باہر نہیں، اور پھر وہاں بھی کیا ہے؟ وہاں آٹھ سو سال پہلے ایک ولی کامل ہوئے تھے۔ اللہ رکھے ہمارے دیوبند اور گنگوہ کو یہاں تو نہ معلوم کتنے قطب مرے پڑے ہیں اگر گنگوہ کی طرف چلنے کی بجائے بھاگنے کی فرمائش کی جاتی تو بات بھی بن جاتی اور خود ساختہ توحید پر آنچ بھی نہ آتی۔ عارفین، کاملین کی تکمیل معرفت تو کعبہ میں بھی نہیں ہو پاتی اور وہ خانۂ خدا میں بھی آگے پیچھے، دائیں بائیں اوپر نیچے گنگوہ کا رستہ تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

پھرے تھے کعبہ میں اور پوچھتے گنگوہ کا رستہ
جو رکھتے اپنے سینوں میں تھے ذوقِ وشوقِ عرفانی

کیا فرماتے ہیں علماء بھارتیہ بیچ اس شعرِ مبارک کے، اگر جائز ہے کعبہ میں بھی گنگوہ کی طرف بھاگم دوڑ تو البتہ جانے دو مجھے میرے گھر سے گیارہ قدم طرف بغداد کے، اور اگر نہیں ہے جائز تو تحقیق کہ لے جاؤ اسے بیچ شمشان بھومی کے اور نذر کردو اس شعر کو اگنی ماتا کے اور لگالو اس کی راکھ کا تلک کہ یہی تقاضا ہے مہاگرو کی منقبت کا یا پھر لاؤ کوئی معقول جواب مثل معقول جواب ''مدیر تجلّی'' کے، جیسا کہ لکھا ہے انہوں نے بیچ پرچے اپنے کے اس میں

"باذن اللہ" کے لفظ سے شرکِ جلی کو خفی بنانے کی سعی کی گئی ہے، لیکن اہل نظر اس لیپا پوتی سے دھوکہ نہیں کھا سکتے۔ ہر گز نہیں، بھلا اہل نظر کس طرح دھوکہ کھا سکتے ہیں؟ اہل نظر کا کام تو دھوکہ دینا ہے، اپنے کو کھدر میں لپیٹ کر کانگریس کو دھوکہ دینا، اقامت دین کے نام پر لاکھوں (ایک اخباری خبر کے مطابق حکومتِ پاکستان مولوی مودودی کے اس جرم کی تحقیق کر رہی ہے کہ انہوں نے لاکھوں کا چندہ وصول کیا اور حساب نہیں دیا) کا چندہ کھا کر عوام کو دھوکہ دینا، وہ تو کم نظر ہیں جو دھوکہ کھائے بیٹھے ہیں اور پونے چودہ سو برس گزر جانے کے بعد اس غریب پرور داتا اور اس کے پیاروں کے در پر حاجت کا دامن پھیلائے ہیں۔

اہل نظر کا کام تو چڑھتے سورج کی پوجا ہے۔ وہ راج بھون کا طواف کرتے ہیں اور وزرائے نامدار کے آگے حاجتیں پیش کرتے ہیں۔

عرض کرے گا بندہ کہ بابا! بجاؤ نوچندی بگل خالص دھن پر دیو بند شریف کی اور پھرا کرو وابستہ ہو جاؤ جہاں؟ چاہو کہ نہیں ملے گا پوچھنے والا کوئی اور جب الگ ہو جاتا ہے رگ اس دھن سے تو گرفت کی جاتی ہے لفظ لفظ کی۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

00000

●

اللہ رکھے بڑی خوبیوں کے مالک ہیں ''صوفی تقا'' صوفی صاحب کا نام تو اچھا خاصا تقی الدین احمد ہے لیکن برا ہو دوستوں کی بے تکلفی کا جنہوں نے اچھے بھلے تقی الدین احمد کو صوفی تقا بنا ڈالا۔

صوفی جی حضرت شیخ کے خاص بلکہ خاص الخاص عقیدت مندوں میں ہیں، جب کبھی شیخ کا ذکر آیا ان کی آنکھوں سے آنسو کے موٹے موٹے قطرے نکل پڑے، پیر صاحب کی تقلید میں ہمیشہ کھدر پہنتے ہیں، پائجامہ اتنا محتاط کہ بس گھٹنوں سے ذرا نیچے رہتا ہے، دور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ نئے فیشن کی ہاف پینٹ ہے کرتے کی لمبائی ہمیشہ جبے کے دھوکے میں ڈالتی ہے، سیاہ چمکتا ہوا چہرہ اس پر ڈیڑھ بالشت کی دودھ جیسی سفید داڑھی، گویا صبح و شام کا سنگم، لوگوں کو ہمیشہ قرآن وحدیث پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ اپنی کھدر پوشی یا جمیعتی پالیسی سے سیمنٹ کا کوٹا لے کر بلیک کرتے ہیں، کبھی کبھی سرکاری ٹھیکہ بھی لے لیا کرتے ہیں، سٹے بازی سے خاص دلچسپی ہے لاٹریوں کا ٹکٹ صاحبزادے کی معرفت خریدتے ہیں، بحث پر اتر آئیں تو مقابل کا ناطقہ بند کردیں، پچھلے ہفتے غلام غوث لاکھ سمجھاتا رہا کہ صوفی صاحب جب اجمیر جانا شرک ہے تو حضرت شیخ کی قبر کی زیارت بھی شرک ہے، چھ گھنٹوں کی بحث کے بعد بھی صوفی صاحب اپنے مقام سے ایک انچ نہ ہٹے اور مرغ کی ایک ٹانگ بنے رہے، یہ ہے ہمارے تقی الدین احمد عرف صوفی تقی الدین تقا کا مختصر ترین تعارف جو آج بھی صبح ہی صبح میرے غریب خانے پر آدھمکے۔

''اے کامل! یہ تمہارا ''نجد سے سہارن پور تک'' کیا بلا ہے؟'' صوفی صاحب نے کسی علیک سلیک کے بغیر ہی پوچھا۔

''صوفی صاحب! پہلے توبہ کیجیے، نجد بھی مقدس اور سہارن پور بھی مقدس اور آپ بلا فرما رہے ہیں؟''میں نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''اونہہ! بتاؤ کہ یہ ہے کیا؟''

''نجد سے سہارن پور تک ہے اور کیا؟''

''پھر وہی خرافات! میں پوچھتا ہوں اس عنوان کا مطلب کیا ہے؟ کہاں نجد اور کہاں سہارن پور؟''

''آپ نے الف لیلہ پڑھی ہے؟''میں نے سوال کیا۔

''ہاں ہاں! اسے تو تین بار پڑھ چکا ہوں، شہزادہ بختاور نے نیلم پری کے فراق میں جو غزل پڑھی تھی وہ تو مجھے آج تک زبانی یاد ہے''، ظالم نے کہا''پھر اسی میں جواب تلاش کیجیے۔''میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں تو تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔''

''تعجب ہے کہ آپ نے الف لیلہ تین مرتبہ پڑھی اور''نجد سے سہارن پور تک''کو آپ نہیں سمجھ سکے، ارے جناب صوفی صاحب ایک مرتبہ لیلیٰ اپنے ناقے پر بیٹھ کر کہیں جارہی تھی کہ اچانک اونٹنی کی نظر مجنوں پر پڑی، نظر پڑتے ہی اونٹنی بدک گئی اور بدک کر سرپٹ بھاگی، مجنوں نے لاکھ کوشش کی لیکن بے قابو اونٹنی ہاتھ نہیں آئی، آگے آگے اونٹنی پیچھے پیچھے میاں مجنوں دوڑتے رہے۔

مسلسل دن رات دوڑتے دوڑتے چوبیسویں روز اونٹنی سہارن پور سے گزر رہی تھی کہ اچانک پیچھے سے ایک پُرجلال آواز آئی۔''رُک جا''اس آواز کے سنتے ہی اونٹنی کے اتنے زور سے بریک لگے کہ وہ فوراً منہ کے بل گر پڑی اور لیلیٰ کے پاؤں میں اتنی سخت موچ آئی کہ وہ بیچاری عمر بھر کے لیے لنگڑی ہوگئی۔

''سچ؟''صوفی صاحب بولے۔

''سچ نہیں تو کیا جھوٹ؟ ارے صوفی صاحب، اس واقعے کا تو مجنوں پر ایسا اثر ہوا کہ وہ

فوراً دادا پیر کے قدموں سے لپٹ کر مرید ہو گیا۔"

"اب تم ہمیں بنا رہے ہو؟" صوفی صاحب نے نیم غصے کے عالم میں کہا، دادا پیر رحمۃ اللہ علیہ تو مجنوں کے بہت بعد ہوئے ہیں۔"

"تو شاید مجنوں کے ابا سہارن پور پڑھنے آئے ہوں گے؟"

"علی بابا چالیس چور" میں مجنوں کے ابا کا نام بھی غالباً "ابو القیس مظاہری" ہی لکھا ہے" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا پاگلوں جیسی ہانک رہے ہو، تم سمجھتے ہو کہ میں کچھ جانتا ہی نہیں، بھلا کہاں مجنوں کے ابا کا زمانہ اور کہاں ہمارا مدرسہ "مظاہر العلوم"۔

"تو پھر دیو بند کا مدرسہ ہو گا؟" میں نے پوچھتے ہوئے کہا، ابے گدھے یہ سب بہت بعد کے مدرسے ہیں۔"

"تو پھر ہمارے شیخ، شیخ البھارت، ڈاکٹر امت، گنگوہ والے، پیر جی، یہ سب بھی بعد کی پیداوار ہیں،"

"یقیناً" صوفی صاحب نے بڑے محققانہ انداز میں کہا۔

"اور ان حضرات کی تصنیفات؟"

"ظاہر ہے کہ وہ بھی بعد کی ہیں؟"

"اور ان کتابوں کی گندہ عبارتیں اور بیہودہ بکواس؟"

صوفی صاحب کا پارہ ایک دم چڑھ گیا، غصے میں کانپتے ہوئے بولے۔

"آ گئے نا آخر تم اپنی خباثت پر، نالائق بدعتی معلوم نہیں تمہارے سر سے بریلویت کا بھوت کب اترے گا؟ یاد رہے کہ تمہارے جھانسے میں نہیں آؤں گا۔ حضرت شیخ کی قسم آج اگر اس کا سبب پوچھے بغیر چلا گیا تو صوفی تقا نام نہیں!"

"صوفی صاحب غیر اللہ کی قسم کھانا شرک ہے۔" میں نے شرعی حکم یاد دلایا۔

"بکواس بند! یہ بتاؤ اس عنوان کا مطلب کیا ہے؟"

''صوفی صاحب سب کچھ پوچھیے لیکن خدا کے لیے اس کا سبب نہ پوچھیے آپ مجھے مرغا بنا لیجیے، الٹا لٹکا دیجیے لیکن۔۔۔!''

''میں کہتا ہوں کہ بتانا پڑے گا'' صوفی صاحب بات کاٹتے ہوئے دھاڑے۔ ''اگر نہیں بتاؤ گے تو شہر میں رہنا مشکل کر دوں گا۔ مسیتا کو تمہارے ہی جیسے ضدیوں کی خبر لینے کے لیے رکھا ہے، اس کے چند ہی گھونسے میں تمہارے دماغ کا سارا گودا ناک کے رستے بہہ نکلے گا۔''

شہر کے سب سے بڑے دادا استاد ''مسیتا'' کے نام سے بڑے بڑے دل گردے والے کانپ جاتے ہیں، پھر میری کیا حیثیت! چاروناچار ضد چھوڑنی پڑی اور انتہائی انکساری سے عرض کیا ''جب آپ بہت ہی اصرار کر رہے ہیں تو سنائے دیتا ہوں لیکن یہ ایک بہت ہی گہرا راز ہے جسے آپ ہی تک رہنا چاہیے۔''

''آخر آ گئے نہ راستے پر'' صوفی نے مسکراتے ہوئے کہا، انداز بڑا فاتحانہ تھا، ''تو ابتدا اس راز کی اس طرح ہے پیارے صوفی صاحب کہ مجنوں کی ساس''۔ ''جب مجنوں کی شادی ہی نہیں ہوئی تو اس کی ساس کہاں سے آئی''، صوفی صاحب نے بریک لگائی، ''جایئے نہیں سناتا۔''

''کیا کہا؟''

''کہا کیا خاک! آپ نے خواہ مخواہ کی ٹوک شروع کر دی، آپ تاریخی واقعات کی چھان بین کیا جانیں؟ آپ نے تو ''الف لیلہ''، ''گل بکاؤلی'' پڑھی ہے اور انہی کی غلط سلط روایتوں پر بھروسہ کر لیا ہے۔ ''بہشتی زیور'' کے جس صفحے پر بکریوں کی مینگنیوں کے فائدے اور چوہے کی آنتوں کی خاصیت لکھی ہے اسی صفحے کے حاشیے پر لکھا ہے کہ بکریوں اور چوہوں کے مندرجہ فوائد مجنوں کی خوشدامن کے آزمودہ ہیں، اب آپ ہی بتائیے کہ جب اس معرکۃ الآرا کتاب میں لکھا ہے تو پھر مجنوں کی ساس تسلیم کروں یا نہیں، اگر آپ کہیں تو ''الف لیلہ'' والی بات مان لوں، لیکن ''بہشتی زیور'' کی تردید کا وبال آپ کے سر۔''

''اچھا اچھا! مجنوں کی ساس'' صوفی صاحب نے جیسے قہر الٰہی سے ڈرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! تو مجنوں کی ساس کی بھانجی کے بھتیجے کی نواسی کے پوتے کے خالہ زاد بھائی کے

سالے کے یہاں ایک مجنوں ابن مجنوں کا جنم ہوا تھا۔''

''کیا نام تھا؟'' صوفی صاحب نے پان کی پیک پچاک سے تھوک کر پوچھا، ''ارے جناب نام تو بڑا مقدس، بڑا پیارا کائنات کا حسین ترین نام ہے جس کے زبان پر آتے ہی منھ میں مصری کی ڈلی گھل جائے ''محمد'' (ابن عبدالوہاب نجدی) لیکن وہ نام بڑا اور درشن کھوٹے والا معاملہ تھا، کہتے ہیں کہ جس دن میاں صاحب زادے نے آنکھیں کھولیں اور اس عالمِ رنگ و بو میں قدم رکھا اس دن ابلیس نے اپنی پوری مملکت میں زبردست پیمانے پر جشنِ چراغاں منایا۔ اپنی ساری رعایا کو ڈنر کی دعوت دی اور اخیر میں وہ تاریخی بھاشن دیا جس کا ایک ایک لفظ کتاب ''صراطِ مستقیم'' کے صفحات پر ثبت ہے۔''

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام او

کہتے ہیں جب صاحبزادے نے رو کر اپنی تشریف ارزانی کا اعلان کیا تو ابلیس نے اپنے تختِ شاہی سے کود کر ننگا ناچنا شروع کر دیا، پوری مملکت میں اعلان کیا گیا کہ آج اتنے عظیم پیمانے پر جشن چراغاں منایا جائے کہ اس کی نظیر کہیں نہ مل سکے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ آج تک اس جشن کی مثال نہیں ملتی۔

رات کو دعوت کے بعد دربارِ عام لگا جس میں سب سے پہلے راجکمار کی آرتی اتاری گئی، مہاراج کے نام کی جے جے کار ہوئی، پھر راج محل کی ساری اپسراؤں نے اپنے سروں پر چراغ جلائے، قومی رقص پیش کیے، اس کے بعد تاجدارِ نجد ابلیس مہاراج نے بھاشن شروع کیا، اپنے موٹاپے کی وجہ سے مہاراج کھڑے ہو کر نہیں بولے، لیکن آج کی خوشی نے انہیں کھڑا بھی کر دیا اگرچہ سنبھالنے کے لیے دو خدمت گاروں کی ضرورت ہوئی جو مہاراج کو توند کے نیچے سے اٹھائے ہوئے تھے۔

دینا بھاشن مہاراجہ نجد کا درمیان اپنی پرجا کے

اور مسرّت کا اظہار کرنا اپنے جانشین کی آمد پر

لیڈیز اینڈ جنٹلمین! آج مابدولت انتہائی مسرت و شادمانی محسوس کرتے ہیں، اس

پیرانہ سالی اور بڑھاپے میں یہی ایک تمنا تھی کہ میرے مشن کو صحیح طور پر سنبھالنے والا کوئی ہوگا یا نہیں؟ یہ ایک اہم سوال تھا جس نے میری رات کی نیند اور دن کا چین ختم کر رکھا تھا، پوری زمین پر ہم نے اپنا جال نہایت مضبوطی اور ہوشیاری سے پھیلا رکھا ہے اور میرے اثر واقتدار کا پرچم اپنے پورے شکوہ وجلال کے ساتھ لہرا رہا ہے لیکن اپنے سب سے بڑے حریف کو اب تک شکست نہیں دے سکا، ہم نے لاکھ چاہا کہ کسی طرح ہمارے دام میں یہ طبقہ آجائے لیکن اس جماعت کا باوا آدم ہی جدا معلوم ہوتا ہے، حاکمانہ اقتدار کی کاسہ لیسی پر آمادہ کرنا چاہا، انگریزوں کی طرف داری پر مائل کرنا چاہا، لیکن یہ کمبخت کسی طرح میری لائن پر چلنے کو آمادہ نہیں، جماعت وجمعیت کے نہ جانے کتنے مورچے قائم کیے لیکن نتیجہ صفر محض ہے، یہ پرانے لکیر کے فقیر دین ومذہب کے معاملے میں ماڈرن بننے کو تیار نہیں اور اس حقیقت کو تم خوب سمجھ لو کہ یہ بریلویت جب تک زندہ ہے میرے مشن کے لیے ایک چیلنج ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو میرے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہیں، آج میرے جانشین کا جنم ہوا ہے جو صحیح طور پر میری جانشینی کے فرائض انجام دینے والا ہے۔ آج ہم مطمئن ہیں کہ میرے مشن کو آگے بڑھانے والے نے جنم لے لیا ہے اور ان خبیث بریلویوں کے مقابلے میں اب ہم تنہا نہیں بلکہ میرا جانشین بھی رہے گا، اب وہ دن دور نہیں جب ان بریلویوں کو شکست فاش ہوگی اور مابدولت پرچمِ اقبال اپنی پوری یکتائی کے ساتھ لہرائے گا تم سب کو اس کی اطاعت وفرماں برداری کی سخت تاکید کرتا ہوں۔

میرے فرزندو! تمہیں صحیح طور پر اندازہ نہیں لیکن میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ جس کام کی تکمیل مجھ سے نہ ہوسکی وہ میرا لختِ جگر کر دکھائے گا۔

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

وہ دن دور نہیں جب ہمارا یہ عظیم الشان جشن پایۂ تکمیل کو پہنچے گا اور ہمارا یہ مقابل اپنی منہ کی کھائے گا، اخیر میں میرے سپوت کی جے جے کار مناؤ۔ بولو راجکمار کی ''جے''؟

”جس کا حکم قضائے مبرم صلی اللہ علیہ وسلم“

”کیا بکتا ہے گدھا کہیں کا؟“ مولانا جمال قاسمی حلق کے بل دھاڑے۔ ”قبلہ بکتا نہیں! اقبال سہیل کی نعت کا ایک مصرعہ عرض کر رہا ہوں۔“

”ابے احمق!“ (وہ ہمیشہ احمق کو امحق ہی بولا کرتے تھے) پڑھنے سے پہلے ذرا غور کیا ہوتا، یہ مصرعہ کتنا بھیانک تصور پیش کرتا ہے، خدا کے رسول کو رسالت و بشریت سے اونچا اٹھا کر اس دائرے میں لے جاتا ہے جہاں ”الحکم للہ“ اور ”والملك لله“ کے سوا کسی کا راج ممکن نہیں۔ بالکل عقل کے اندھے ہو، اس مصرعہ میں کھلا ہوا شرک ہے، حکم تو صرف اللہ کا ہے، رسول کے لیے تو احکام میں کوئی حصہ نہیں، اس تصور سے تو خدا کو ثانوی اور رسول کو اوّلین حیثیت ملتی ہے جو توحید کے سراسر مخالف ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تم نے صراطِ مستقیم اب تک تلاوت نہیں کی ہے۔ ہزار بار سمجھا چکا ہوں کہ بریلویت کے چکّر میں نہ پڑو، بھلے آدمی! اگر آج بھی ہماری جمیعت میں شامل ہو جاؤ تو الاّ قسم مزہ کرو گے مزہ! زندگی کی ساری دلفریبیاں اور رعنائیاں تمہارے دامن میں نہ آجائیں تو تھوک دینا میرے منھ پر!“

یقین مانیے مولانا کے اس مخلصانہ مشورے نے ازبسکہ پہنچا دیا مجھ غریب فتو کو تھوڑی دیر کے لیے ایسی رنگین دنیا میں جہاں زندگی کے سارے حسن، حیات کے سارے جمال اپنی رعنائی و دلفریبی کے ساتھ میرے اردگرد بکھرے پڑے تھے۔

کرنسی نوٹوں کے لطیف لمس، برق رفتار سواریوں کی دلفریب کیفیت، فلپس کے بہترین ریڈیو کی نغمہ نوازی، پوری دنیا کی خبریں، سجا ہوا ڈرائنگ روم، جسم پر قیمتی لباس، تنھے کے لیے تین پہیوں والی بائیکل، تالیوں کے شور میں قومی اداروں کا ادگھاٹن، وزرائے نامدار کا تقرب، اس کے ساتھ پارٹیاں، غرضیکہ نور ونکہت کی ایک پوری معطر دنیا فلم کی طرح ذہن

کے پردے پر چلتی پھرتی حرکتیں کرتی نظر آنے لگی۔

''اب کیا سوچ رہے ہو، کہہ تو دیا مزہ کرو گے مزہ!'' مولانا کی اس مداخلتِ بے جانے سین ڈراپ کر دیا اور خیالات کا تاج محل ایک دھڑام سے زمین پر آ گیا۔ جی میں آیا کہ مولانا کا گلا دبا دوں، لیکن یا الٰہی یہ کیا؟

آج تو خلافِ معمول روئے زیبا پر کئی من فی منٹ کی رفتار سے نور برس رہا ہے، فخر سے گردن اکڑی ہوئی ہے اور معنیٰ خیز مسکراہٹ ہونٹوں پر مچل رہی ہے اور میں ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔

''ابے! احمقوں کی طرح کیوں گھور رہے ہو؟ میں غلط تھوڑے ہی کہہ رہا ہوں!''

اور واقعی میں الو کا پٹھا بنا مسلسل گھورے جا رہا تھا نہ جانے ساری حاضر جوابی کہاں رخصت ہو گئی تھی۔

''بولو تیار ہو؟''

ساری قوت گویائی سلب ہو چکی تھی، جواب دیتا تو کیسے؟ کوشش بھی کی تو آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی، آخر بڑی مشکل سے کھنکار کے گلا صاف کیا اور دست بستہ عرض کیا۔

''اے بلبلِ باغِ توحید! اے سروِ چمنستانِ وحدانیت! حضرت ماحیٔ شرک و بدّت، قاطع بریلویت، حقا کہ آپ کی ذاتِ گرامی ہے، توحید کا ستونِ اعظم البتہ فرق کرتے ہیں، آپ ہی ہر ہر قدم پر توحید و رسالت میں اور حدیں مقرر فرماتے ہیں دونوں کی۔

اے خلوصِ مجسم! البتہ تحقیق کہ پہنچا دیا آپ کے ارشادِ بلیغہ نے اس کمترین کو جیتے جی بہشت بریں میں، ابھی سے پہنچ گیا ہے، یہ خادم آپ کا ایسی دلفریب وادی میں کہ معطر ہوئی جاتی ہے مشامِ روح اس کی خوشبوئے معنبر سے، ہر آئینہ ہے آپ کا مشورہ میرے لیے ضمانت عیش و راحت کی، لیکن کھدر کا کھردرا پن جسم کے لیے تکلیف کا باعث ہے یعنی الجھ گئی ہے ایک گتھی ایسی کہ نہیں سلجھتی بعد کوشش بسیار کے، استعمال کر چکا ہوں کھوپڑی کی ساری طاقت واسطے حل اس کے، لیکن نہیں ہاتھ آتا گوہرِ معانی اس کوڑھ مغز کے، اگر حل فرما دیں

آپ تو البتہ کردوں گا توبہ اسی وقت اپنی بریلویت سے اور ابھی داخل کروں گا فیس ممبری کے واسطے شامل ہونے جمعیت پارٹی کے۔" "بخدا ایک نہیں ایک سو ایک سوال کرو جواب کے لیے حاضر ہوں۔"

"لیکن ذرا جلدی کہہ ڈالو دفتر کے بند ہونے میں صرف آدھا گھنٹہ باقی ہے۔" "کیا عرض کروں؟ بس وہی مصرعہ دردِ سر بنا ہوا ہے۔"

"کون سا مصرعہ؟"

"وہی! جس پر ابھی آپ نے تنبیہ فرمائی ہے جس کا حکم قضائے مبرم" "لاحول ولا قوۃ، اس میں ایسی کون سی بات ہے جو تمہاری عقل میں نہیں آتی، صاف بات یہ ہے، حکم اور اٹل حکم صرف اللہ کا ہوتا ہے غیر کی طرف اس کی نسبت شرک ہے۔ لو! اب تو تشفی ہوگئی! چلو دیر ہو رہی ہے، ہمیں سیٹھ نتھامل کے یہاں ذرا جانا ہے۔"

"لیکن۔۔۔"

"اب لیکن ویکن کیا؟" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے۔

"ارے حضرت! یہی تو وہ مقام ہے جہاں عقل الٹی ٹنگی فریاد کر رہی ہے اور غریب کی فریاد پر کان دھرنے کے لیے کوئی آمادہ نہیں، آپ کے اور دادا میاں کے نظریے میں بڑا فرق اور تضاد ہے۔"

"ہا... ہا... ہائیں کیا کہا تضاد؟"

"جی ہاں! بالکل تضاد، صد فیصد تضاد! آپ کو خبر ہے کہ جب پردادے میاں مر کر مٹی میں مل گئے تھے تو غم میں دادے میاں کی کیا حالت تھی؟ بیچارے صبح و شام روتے رہتے تھے اور جھوم جھوم کے یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

نہ رکا پر نہ رکا پر نہ رکا پر نہ رکا
اس کا جو حکم تھا سیف قضائے مبرم

میں نے یہی بات اس ذاتِ اقدس کی طرف منسوب کی جو خدا کے بعد سب سے معظم و

محترم ہے تو آپ کو شرک کے جراثیم نظر آ گئے اور دادے میاں یہی بات اپنے ابو صاحب کے لیے انتہائی عقیدت سے کہتے تھے تو کچھ بھی نہیں، حالانکہ خدا کی عظمت اور کبریائی کے آگے پردادے میاں کی کوئی حیثیت نہیں۔ سیٹھ دولت رام کے آگے جو حیثیت بھکاری چمار کی ہے وہ بھی نہیں۔"

میرے اس انکشاف پر مولانا کی حالت ازبسکہ قابلِ دید تھی سر سے پاؤں تک غیظ و غضب کی زندہ تصویر بنے پاؤں پٹکتے ہوئے سیدھے گھر کی راہ لی لیکن خاموش نہیں میری ساتوں پشت کو بخشتے ہوئے، میں نے ہزار کہا کہ "قبلہ ٹھہریے! جمیعت کا ممبر بننے کے لیے میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں اور ذرا ممبری فیس کے لیے بیگم صاحبہ سے چونّی لے لوں لیکن۔

کیا سمجھے ناظرین بیچ اس خامہ فرسائی کے۔ ارے جناب! گنگوہ کے ایک پیر جی تھے (نام مجھے یاد نہیں، ایڈیٹر پاسبان سے پوچھ لیجیے) جن کا ہر حکم اٹل تھا، اتنا اٹل کہ کوا کھانا حلال کیا تو اب تک کوئی مائی کا لال اسے حرام نہ کر سکا اور جب پیر جی مر گئے تو ان کے ایک دیوبند باسی شاگرد نے مرثیہ لکھا لفظ مرثیہ پر چونکیے نہیں۔۔۔ مرثیہ تو صرف حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ناجائز ہے پیر جی کی عقیدت مندی میں تو سب کچھ عین ثواب ہے چنانچہ حصولِ ثواب کے لیے تمام عقیدت مندوں نے جھوم جھوم کر گایا۔

نہ رکا پر نہ رکا پر نہ رکا پر نہ رکا
اس کا جو حکم تھا، تھا سیف قضائے مبرم

اور جب یہ بات دوسرے نے حضور کی طرف منسوب کر دی تو توحید کے ٹھیکیدار خوردبین لے کر کھڑے ہو گئے اور شرک کا کیڑا نکال ڈالا، پیر جی کے آگے رسول کی کیا حیثیت توبہ توبہ نعوذ باللہ!

دین و اسلام کے معاملے میں خوردبین لگانے والے اور توحید و شرک کے درمیان بلا تکلف خطِ امتیاز کھینچنے والے، کاش! اک ذرا دیر کے لیے سوچتے کہ جس بات کو ہم بلا تکلف شرک گردان رہے ہیں، اسی شرک کا ارتکاب میرے بڑوں نے بھی کیا ہے، رسالت کے

معاملے میں جب یہی بات! کھلا شرک قرار پاسکتی ہے تو آپ کے بزرگوں میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ دیانت اور انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لیتے اور ان بزرگوں کے عقیدت کیشوں کی کلائی تھامتے جو فرطِ عقیدت میں نہ جانے کیا الائے بلائے بک گئے ہیں پھر آگے بڑھتے۔ یہ نہ سہی اس شعر کو شرک ثابت کرنے کے بعد کم از کم یہی کہہ دیا ہوتا کہ اسی طرح کی غلطی ہمارے بزرگوں سے بھی ہوگئی ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکے کہ یہ رسول کی دشمنی ہے یا اپنے بزرگوں کی غلط عقیدت مندیوں کا غلط نتیجہ۔ آخر جب بات آپ کے گھر کی ہوتی ہے تو کیوں منہ میں دہی جم جاتا ہے اور رسالت کا معاملہ ہوتا ہے تو زبان وقلم دونوں اسّی میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل پڑتے ہیں۔ ع

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

00000

●

اگر میں یہ کہہ دوں کہ ایک مینڈک کا بچہ حضرت اونٹ کی نکیل پکڑے صحرائے نجد میں گشت کرر ہا تھا اور اونٹ کی دم کے ساتھ ایک ٹریکٹر بندھا ہوا تھا جسے ایک بندر چلا رہا تھا تو چاروں طرف سے تھوتھو ہوگی کہ لوگوں کے تھوک میں دب کر مرجانا پڑے گا، اور ایسے ایسے اعتراضات ہوں گے کہ مولانا کامل بقلمِ خود کی عقل وخرد داغِ یتیمی دے کر اس طرح فرار ہوگی کہ آگرہ جانے کے باوجود واپس آنے کا نام نہیں لے گی، کوئی کہے گا بندر ٹریکٹر کس طرح چلائے گا، میں ہزار کہوں گا کہ حضور! سرکس کا بندر جب سائیکل چلا سکتا ہے تو نجد کے بندر کو ٹریکٹر چلانے سے کون سی چیز روک سکتی ہے لیکن میری یہ دلیل کوئی تسلیم نہیں کرے گا، کوئی فرمائے گا کہ صحرا میں مینڈک کہاں سے پیدا ہو گئے؟ میں لاکھ کہوں کہ جناب تری اور خشکی دونوں قسم کے مینڈک ہوتے ہیں، تری کا وہ جو برسات میں پھدکتا ہے اور خشکی کا وہ جو بوریا بستر سر پر رکھ کے گاؤں گاؤں پھدکتا پھرتا ہے، اور لوگوں سے کلمے پڑھواتا ہے، کھدر میں اپنے کو چھپا کر حکومت اور عوام دونوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے اور احیائے دین کے نام پر دین کو کند چھری سے ذبح کرتا پھرتا ہے لیکن میرے دلائل قاطعہ کوئی تسلیم نہیں کرے گا، چچا غالب کا وہ مصرعہ بھی پڑھ جاؤں ۔

مچھلیاں دشت میں پیدا ہوں ہرن دریا میں

تو بھی وہی مرغے کی ایک ٹانگ، اس لیے کہ کامل صرف کامل ہے شیخ الکل نہیں ہے، طبیب ملت نہیں ہے، اس کی ایک ایک بات پر جرح وتنقید کی جائے گی اس کی تحریر کی ایک ایک سطر کو تحقیق کی دوربین لگا کر دیکھا جائے گا اور اگر گنگوہ والے پیر جی کے خلیفہ اپنی قینچی کو استرا کہہ دیں تو تسلیم! میرے پیر صاحب تو صدیق وفاروق تھے عقیدت مند کہہ اٹھیں گے

حضور بیشک تھے بلکہ اس سے زیادہ تھے۔ پیر صاحب قبلۂ حاجات تھے! بجا ارشاد، بلکہ مرکز اجابت تھے پیر صاحب ساری مخلوق کے مربی تھے۔ بے شک نہ صرف مربی بلکہ مربًا ہیں۔ آپ لاکھ سر ماریں کہ بھائی! صدیق وفاروق (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) نے مشاہدۂ نبوۃ کیا تھا۔ ان کے مقابلے میں امت کا کوئی فرد نہیں ہوسکتا ہے۔ لیکن اندھی تقلید کے آگے سارے حقائق غلط! وہ تو خیر ہوگئی کہ پیر جی کو صرف صدیق وفاروق ہی بنایا گیا، اگر رسول یا پیغمبر کہہ دیتے تو بھی عقیدت مندوں کو تسلیم کرنے میں پس وپیش نہ ہوتا۔ بھلا شیخ جھوٹ کہہ سکتے ہیں۔ امت کے خودساختہ حکیم جی غلط کہہ سکتے ہیں کیا سمجھے! ارے حضرت ان کا خدا جھوٹ بول سکتا ہے لیکن شخصیت مآب جھوٹ نہیں بول سکتے۔

اگر میں بھول سے بھی کہہ دوں کہ خواب میں دیکھا تھا کہ حضور کی میلاد ہورہی ہے فرشتے کھڑے ہوکر صلوٰۃ وسلام پڑھ رہے ہیں تو پورے خواب کی دھجیاں اڑادی جائیں گی لیکن اگر کہنے والے اس کے خلاف کہہ دیں تو بلاتامل سر عقیدت سے خم ہوجائے گا، کتابوں میں چھاپ دیا جائے گا۔ ایک خواب ملاحظہ ہو۔

"تو جب یہ کتاب لکھی گئی (طریقہ مولد) تو مجلسِ میلاد کے متعلق کانپور میں لوگوں نے بہت شور کیا اسی اثنا میں ایک شخص صالح (نام کے انتخاب کی داد دیجیے) نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور اس اختلاف کے متعلق حضور سے دریافت کیا گیا کہ اس میں صحیح کیا ہے تو حضور نے فرمایا کہ اشرف علی نے جو لکھا ہے وہ سب صحیح ہے۔"

جی ہاں! بالکل صحیح ایک سو ایک فیصد صحیح آپ نے حضور کو جہاں جہاں گالیاں دے کر اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے اسے خواب میں دریافت کرتے تو حضور یہی فرماتے کہ الجوابُ صحیح ...اور کوئی سرپھرا پھر تکذیب کی جرأت تو کر نہیں سکتا کیونکہ خواب والی صبح کو آپ کی پیشانی پہ لکھا ہوتا ہے کہ "آنجناب جو کچھ خواب بیان فرمائیں گے وہ بالکل صحیح ہے۔"

کسی نے خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت شیخ کا مقتدی کردیا، کسی نے میلاد کے ناجائز ہونے کی تصدیق خود حضور سے کرائی اب ان شاء اللہ کوئی خواب دیکھے گا،

فلاں شیخ صاحب، فلاں حکیم صاحب عرش پر بیٹھے خدائے تعالیٰ کے سامنے دیو بندیت کی تبلیغ کرر ہے تھے، بس ایک ذرا سی ہمت چاہیے، خیر اس خواب کی دنیا کو چھوڑیے، اس وقت نومبر کے پاسبان کا وہ صفحہ پیش نظر ہے جس میں مسٹر جعفری نے ایسے اہم، مشکل اور باوزن سوالات کیے ہیں کہ ان کے جوابات میرے سوا کوئی دوسرا دے بھی نہیں سکتا اور اس وقت میرے پیٹ میں چوہا بھی کودر ہا ہے۔

پس تحقیق کہ بداں اے عزیز! یعنی جانو تم اے مسٹر جعفری کہ رکھتا ہوں میں چند سوالات آگے تمہارے، اگر دیے تم نے اس کے جوابات کافی وشافی تو البتہ تسلیم کرلوں گا میں تمہاری بقراطی کو ساتھ اپنے دل کے اور دوں گا اس کے بعد جواب تمہاری حماقتوں کا مدلل جیسا کہ حق ہے دینے کا۔

(۱) لکھا ہے تم نے الحاج تیئں اپنے کے ہو اس معاملے میں تم بقلم خود یا تحریر کیا ہے کسی اور نے؟ بر بنائے اوّل بنے البتہ میاں مٹھو خود اپنے منھ سے اور بر بنائے ثانی کیوں نہیں قطع کرلیا ہاتھ لکھنے والے کا کہ تھی غلاظت تمہاری طرف سے کہ نہیں لکھتے عقل کے اندھے بھی اپنے نام کے ساتھ القاب کو اور کیا ثبوت ہے اس کا کہ تم ہو الحاج؟

(۲) سنتے ہیں کہ تم پہلے جنم میں تھے گدھے اور پھر ترقی کر کے ہو گئے انسان اگر تم تھے پہلے جنم میں وہی تو کیوں اور نہیں تو کیوں؟

(۳) کیا سمجھتے ہو تم خارجی، معتزلی، رافضی، قادیانی، مہدوی وغیرہ کو؟ اگر سمجھتے ہو ان کو مسلمان تو ثبوت پیش کرو ان کے اسلام کا اور اگر سمجھتے ہو ان کو خارج از اسلام تو تم خود کیوں نہیں مشورے دیتے حکومت وقت کو کہ نہیں ہے یہ جماعت مسلمانوں کی اور نہ لکھے انہیں درمیان کاغذات کے مسلمان اور دباؤ ڈالو حکومت پر کہ البتہ توڑ ڈالے ان کی عبادت گاہوں کو؟

(۴) جن کو تم کہتے ہو شیخ الاسلام اور بٹھا دیا ہے مشیخیت کے آسمانِ ہفتم پر تو البتہ اس بھاری بھر کم خطاب پر متفق ہے پوری دنیائے اسلام؟ اور یہ خطاب ہے سارے ممالک اسلام کا عطا کردہ یا عطا کیا گیا ہے یہ خطاب احاطۂ دیوبند میں؟

(۵) ایک عام عقیدے کے مطابق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم خدا کے بعد ساری مخلوق سے زیادہ ہے، پس مثال دے جو شخص حضور کے علم کو چوپایوں اور پاگلوں کے علم سے تو وہ کافر ہوا یا نہیں؟ اگر ہوا تو اپنے حکیم الامت کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

(۶) ایک عام عقیدہ ہے کہ آخر زمانے میں ہوں گے اسلام میں تہتر فرقے جس میں ایک ہوگا اہل حق کا اور ہوں گے باقی گمراہ، پس اگر کہتا ہوں میں جماعت کو اپنی اہل حق تو کیوں تمہیں ہے اعتراض؟ اگر تم ہو اہل حق تو پیش کرو دلیل قویہ ورنہ تسلیم کرو اپنی گمراہی۔ ختم کرتا ہوں اپنے سوالات کو اس دعا پر کہ بنالیں ہندوستان کے سارے پاگل متفقہ طور پر تمہیں لیڈر اپنا جیسا کہ حق ہے لیڈر بنانے کا۔

00000

●

میں تو پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ ایڈیٹر پاسبان صلح کلّی قسم کے سنّی ہیں، مومنین، کاملین، صادقین کی صف میں ان کا نام ہرگز نہیں آتا۔ لیکن اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑتا۔ ''قہر درویش برجان درویش'' صبر کیے ۔۔۔۔ مبارک عین تبارک دن کا منتظر تھا جب ان کا بھانڈا بیچ چوراہے پر پھوٹے اوران کے غرور کا سر ٹوٹے۔ ''انّ اللہ مع الصابرین'' کل صبر کا پھل مل گیا صوفی چقندر شاہ نے بات بات میں آخر کہہ ہی دیا کہ ''پاسبان والے مشتاق میاں صلح کلّی ندوی ہیں۔''

عرض کیا ''صوفی صاحب ان کے صلح کلّی ہونے پر میرا ایمان، لیکن ندوی ہونا میری سمجھ سے باہر ہے، نہ وہ خود ندوہ گئے نہ مولانا نظام الدین و مولانا حبیب الرحمٰن صاحبان ندوہ میں مدرس رہے اور پھر...،

''ابے گدھے! تم نہیں جانتے، یہ سب صلح کلّی ہیں۔ لوگوں کو احمق بناتے ہیں، یعنی کہ اس طریقے سے خوب 'ملغوبہ' کھاتے ہیں'' صوفی جی نے درمیان ہی میں بریک لگاتے ہوئے کہا۔

''صوفی جی! آپ بہک رہے ہیں اور جسے چاہیے کہہ لیجیے، لیکن مجاہد ملّت کے متعلق اس قسم کے گندے خیالات آپ جیسے ثقہ بزرگوں کو زیب نہیں دیتا۔''

''ابے ایسے ایسے کتنے دیکھے ہیں کچھوچھہ سے لے کر بریلی تک، ہر ایک پر توبہ ضروری ہے ورنہ اسلام سے دوری ہے۔''

''ہائیں.....!''

''ابے ہائیں کے بچے، تم کیا جانو حضرت خلیفہ صاحب نے ان لوگوں کے چہروں سے

نقاب الٹنی شروع کردی ہے اور ساری صلح کلّیت طشت از بام کردیا ہے، یعنی بدنام کردیا ہے، آپ کے دماغ کے متعلق تو نہیں جانتا لیکن میری کھوپڑی شریف میں سیٹیاں بجنے لگیں۔''

دست بستہ عرض کیا ''حضور صوفی صاحب! خلیفہ نے قینچی اور استرے کا دھندا چھوڑ کر قلم کا دھندا کب سے شروع کردیا، یعنی بال مونڈنے کی بجائے حقائق کا سر کب سے مونڈنے لگے۔''

''اماں! وہ خلیفہ نہیں بلکہ ہمارے حضرت پیر و مرشد کے خلیفہ ہیں۔ عجیب نالائق ہو تم! صوفی صاحب نے کہا۔

''آپ کے پیر یعنی الملقب بہ لقب ہادی عالم۔''

''ہاں ہاں وہی!''

کیا سمجھے ناظرین کرام درمیان ان القاب مبارکہ کے یعنی اب تک سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ہادی عالم تھے لیکن بن گئے ہر آئینہ البتہ تحقیق کہ ہادی عالم ایک پیر صاحب جیسا حق ہے بننے کا تو جناب قصہ مختصر!''

صوفی صاحب نے ایک کتابچہ دیتے ہوئے کہا ''لو یقین نہیں آتا تو دیکھ لو۔''

کتاب لے کر اوپر سے دیکھا نیچے سے دیکھا لیکن خاک سمجھ میں نہیں آیا، اوّل تو کتاب کے سرِ ورق پر مختلف قسم کے موٹے موٹے عنوانات اور پھر عربی کے جملے، ترجمہ بھی ایسا کہ مجھ جیسا پرائمری پاس انسان زندگی بھر نہ سمجھ سکے۔ سب سے موٹے عنوان کے ترجمے کا پہلا لفظ تھا ''علماؤں'' قاعدہ بغدادی سے لے کر پرائمری تک کی ایک ایک کتاب دیکھ لی لیکن کہیں نہ ملا کہ ''علماؤں'' واحد ہے کہ جمع۔ اگر بتا دیں ناظرین تو نذر کروں گا ایک کتابچہ صوفی چقندر شاہ سے لے کر بیرنگ، دوسرا تاریخی نام پڑھ کر تو عقل شریف سات سلام کر کے رخصت ہوگئی، حضرت شیخ کی سوا پانچ پیسے کی نیاز بھی مانی لیکن سمجھ میں نہ آیا خواب میں دیکھا کہ سارے تاریخ گو سر پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا آپ بھی پڑھیے اور منہ پر دو تھپڑ ماریے اور کوتاہی عقل کا ماتم کیجیے، یعنی اس کتاب کا لاجواب تاریخی نام ہے

''غدر بے باک عالم''

۱۳۸۰ھ

یقین ہے اس معاملے میں کہ آپ سب میری ہی طرح ہوں گے اور زندگی بھر اس کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔ آپ کہیں گے کہ باہر کے حسن ورعنائی کا حال یہ تھا تو پھر اندر کیا ہے؟ ذرا اسے بھی بتادو، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں۔ ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

پوری کتاب مدیر پاسبان کی منقبت کا سدابہار گلدستہ ہے جس جملے پر نظر پڑتی ہے، ایک نئی خوشبو محسوس ہوتی ہے، کہیں گلاب، کہیں موتیا، کہیں بیلا ہے، کہیں چمبیلی، کہیں چمپا ہے، کہیں موگرا۔ میری قوت شامہ تو بالکل الٹی ہوگئی ہے، اس لیے ہر ہر جملے پر ناک پر رومال رکھنا پڑا، کہیں کہیں متلی بھی آئی، اگر آپ کی قوت شامہ صحیح ہو تو چند جملوں کی خوشبوئے جانفزا سے مشام روح کو معنبر کیجیے ملاحظہ ہو۔

''اللہ تعالیٰ نے ایڈیٹر پاسبان الٰہ آباد والے کو توبہ کی توفیق دی، یعنی مدیر پاسبان بغیر توبہ کیے مر گئے اور رند نما جدید کتابی کفار اہل ندوہ اور سیرت کمیٹی صلح کلّیت وغیرہ؟ والوں کے ہمراز ہیں، ولاشک، ولاریب وغلاف پوشین سنیت میں ایک بھیڑیا؟ صلح کلّیہ ہے کہ اپنے پاسبان میں گاہے گاہے برابر صلح کلّیوں کی توصیف وتحسین کچھ ہیر پھیر کے ساتھ چھاپ کر شائع کرتا رہتا ہے۔''

امید کہ صرف تین جملوں میں چودھوں طبق روشن ہوگئے ہوں گے۔

''برادرم ولی محمد تھام والے ہیں کہ ایڈیٹر پاسبان کی سنیت کا ڈھول پیٹ رہے ہیں اور تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملا رہے ہیں، خلیفہ جی کی تحریر پڑھ کر ان کا مزاج بھی از بسکہ صاف ہوجائے گا۔''

''خدا کی قسم! سنیت ہو تو ایسی ہو کہ دنیا میں صرف ایک ہی سنی ہیں اور باقی سب پر توبہ لازم ہے۔''

’جی ہاں! سب پر توبہ لازم ہے، ایک بیچارے مدیر پاسبان کا ایمان نہیں خراب کیا گیا ہے بلکہ مجاہد ملّت، مولانا مظفر حسین کچھوچھوی، مولانا سراج الھدیٰ وغیرہ کی ایسی مٹّی پلید کی گئی ہے کہ عاقبت روشن ہوگئی ہوگی، اور بات یہیں ختم ہو جاتی تو خیر! لیکن یہاں تو یہ عالم ہے کہ کانفرنسی بے توبہ والے سنّیوں اور مکار وغدار سیرت کمیٹی والے۔“

نہیں سمجھے، ارے جناب جب مجھے ازار بند باندھنے کی تمیز نہیں تھی اس زمانے میں بنارس میں سنّی کانفرنس ہوئی تھی، سنتا ہوں کہ اس میں حضرت محدث اعظم ہند رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ صدر الافاضل رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے اور سب پر توبہ لازم ہے اور یہ اس لیے کہ شاید ”الملقب بہ لقب ہادی عالم“ بقلم خود کو مسندِ صدارت نہیں ملی تھی۔

”چھوڑیے کہاں تک کہوں، یقین جانیے پوری کتاب میں اتنی غلاظت ہے کہ اگر میونسپلٹی کے پاخانے میں اسے ڈال دیا جائے تو اس کی بدبو پر ہمارے خلیفہ جی کی کتاب غالب آجائے گی۔

زبان وادب کے اعتبار سے تو ایسی ہے کہ بس نثر میں شاعری ہی شاعری ہے۔ چچا غالب بھی قبر کے اندر طبلہ بجاتے ہوں گے ملاحظہ ہو۔

جو جواب بھیجا اس کا نقل عواموں کی دانشت میں چھاپ کر شائع کرتا رہتا ہے۔“

”بے امتیازی کی بندش میں غرق رہا کرتا ہے۔“

”مئے جام خمار جوش زر کشی۔“

لفظ ”خفیہ“ متعدد جگہ ”خوفیہ“ تحریر فرمایا گیا ہے۔

لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ ”الصلحۃ الکلیۃ“ یعنی اخیر کا لفظ بھی آیت کا جز ہے۔

یہ مبلغ علم ہے اس ذاتِ گرامی کے خلیفہ کا جس کا نامِ نامی ہمیشہ دو چار سطروں میں لکھا جاتا ہے اور اس علم پر ہمت یہ کہ سارے علمائے اہل سنّت کو للکارا جا رہا ہے۔ چنانچہ اخیر میں درج ہے۔

”اگر چھیڑ چھاڑ کی ٹھہری تو اس سے بھی زیادہ وضاحت ممکن ہے“ یعنی یہ کوئی سنجیدہ

اعتراض نہیں بلکہ چھیڑ چھاڑ ہے۔"

اب اس چھیڑ خانی پر اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ جب اللہ گدھا بنائے تو دو سینگ بھی عنایت کردے...

جب اپنوں کا یہ عالم ہے پھر غیروں کا عالم کیا ہوگا۔

ہیں درمیان شہر ہمارے کے مولانا صاحب مبلغ ایک عدد بھاری بھر کم باعتبار جسامت کے اور باعتبار قدوقامت کے ومنزلت کے کہ ہیں حلقہ بگوش اور عقیدت مند لوگ ہر ایک خیال کے یعنی کہ لوٹتے ہیں۔ البتہ مولانا ہمارے عوام کو دونوں ہاتھوں سے جیسا کہ حق ہے لوٹنے کا۔ صاحبزادگان تو ہیں ہر آئینہ مرید و کفش بردار حضرت شیخ کے۔ اور بڑی سختی سے قائم ہیں شیخ جی کی ایک ایک سنّت پر، بازار سے لے کر گھر تک ہر جگہ جھاڑتے ہیں فتویٰ اسی زد میں کہ چھوٹ چکیں دو بیبیاں اور ہو گئے بے چارے رنڈوے، اگر چلتا بس ان کا تو نکال دیتے گھر سے اپنے اس کو، ان کا زور اس بات پر ہے کہ نہیں ہونی چاہیے میلاد کبھو، اور فاتحہ بالکل، اور نہیں پکنے چاہیے حلوے شب برأت کے، اور سوئیاں عید کی لیکن کرتی ہیں سب کچھ مولانی جو کچھ کرنا چاہیے۔ اور ذرا نہیں گھبراتیں صاحبزادے کے فتوے سے، بلکہ پکاتی ہیں مولانی سوئیاں عید میں اور کہتی ہیں برائے فاتحہ کے کہتے ہیں بڑے زور و شور سے صاحبزادگان بعد پڑھنے نعوذ باللہ اور استغفر اللہ۔

''اماں یہ گناہ اور بدعت میرے یہاں ہرگز نہ ہوگی۔''

پس آ جاتا تاؤ اس فتوے پر مولانی کو اور جھاڑ پلاتیں صاحبزادوں کو اس طرح۔

''موئی جھاڑو سے ماروں گی، بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارے فتوے، خدا کی مار! تیوہار آئے اور گھر کے مردوں کو فاتحہ نہ ہو۔''

پس فاتحہ کر دیتے فرزندار جمند اس ہفوات پر نہایت سعادت مندی سے اور پھر ہاتھ صاف کرتے چارو ناچار بغیر کہے کسی کے جیسا کہ حق ہے ہاتھ صاف کرنے کا۔

آمدم برسرِ مطلب یعنی آیا میں مولوی صاحب کے سر پر۔ ہیں مولانا ہمارے اس

نظریے کے قائل ہیں۔ ع

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

بیان فرماتے ہیں ہمیشہ کرامات حضرت شیخ کی درمیان ان کے عقیدت مندوں کے اور ترغیب دیتے ہیں، ہمیشہ حضرت شیخ کی بیعت کی کہ تھا کمیشن فی مرید عام دو روپے سکہ رائج الوقت مولانا کے لیے مقرر صدر دفتر سے۔ اور جائز فرماتے ہیں درمیان ہم جیسے بریلویوں کے قبروں پر جانا فاتحہ کرنا بلکہ ایک ہاتھ آگے رکھ کر فرماتے ہیں کہ جائز ہے سجدہ کرنا قبروں کو سجدۂ تامہ، اور جب پکڑ لیے جاتے ہیں درمیان دونوں کے تو ہو جاتے ہیں گول ایک دم مثل گول ہونے تربوز کے۔ نصیحت فرماتے ہیں ہر ایک کو گول ہونے کی مثل گول ہونے اپنے کے، پکڑ لیے گئے البتہ ایک دن مولانا درمیان میرے اور خصم کے، عرض کیا حضور قبلہ! تشریف لے چلیں غریب خانے پر فاتحہ کرانی ہے آپ سے حضرت مشکل کشا کی۔ سہم گئے میری اس درخواست پر مولانا کہ تھے ان کے ساتھ ایک بڑی توند والے سیٹھ صاحب، دیا کرتے تھے بڑی رقم چندے میں اور اکثر پیش کرتے تھے نذرانے حضرت مولانا کو، اگر ہوتا کوئی دوسرا میری جگہ پر تو البتہ فرماتے مولانا ''کمبخت نالائق، بدعتی مجھ سے اس گناہ کے ارتکاب کے لیے کہتا ہے، جہنمی کہیں کا، لیکن چونکہ میں جانتا تھا، ان کی سیاستِ عظیمہ کی ایک ایک تکنیک کو اس لیے سہم کر رہ گئے اور بات بنانی یوں شروع کی یعنی سیاست کے پینترے اس طرح بدلنے لگے۔

''عجیب آدمی ہو یار! تم لوگ اس روز روز کی فاتحہ خوانی سے تو بس ناک میں دم آگیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کتنی فاتحہ دلاؤ گے، کیا فائدہ روز روز کی اس فاتحہ خوانی سے؟''

تو پھر فرما دیجیے فرمایا صاف صاف کہ فاتحہ ہے ہر آئینہ ناجائز اور بیکار نزدیک آپ کے لیکن...

میرے اس لیکن پر بالکل گھبرا اٹھے فرمانے لگے ''نہیں نہیں میرا مطلب ہرگز یہ نہیں، میں تو اس کو مستحب اور کارِ ثواب سمجھتا ہوں لیکن یہ روز روز کی اور پھر تاریخ کا تعین کر لینا اور

فرض، واجب سمجھ لینا کچھ اچھی چیز نہیں!''

عرض کیا ''اے علم و فضل کے گول گپا، اگر سمجھتے ہیں آپ اسے مستحسن پھر خوش ہو جیے اس روز روز کی فاتحہ خوانی سے کہ یہ ہے کارِ ثواب بہر حال اگر معین کرنا اوقات کا مکروہ ہے تو بتایئے ہمیں اور لایئے دلیل تو یہ پاس میرے کہ آپ کون سا کام کرتے ہیں بغیر تعین اوقات کے اور یہ کہ کس الّو کے پٹھے نے سمجھ لیا ہے ان کاموں کو فرض یا واجب، اور کون عقل کا اندھا سمجھتا ہے ان کاموں کو مثل نماز روزے کے اگر سمجھتا ہے کوئی ایسا تو نشاندہی فرمایئے اس چوپٹ ناتھ کی ورنہ واپس لیجیے اپنے الفاظ کو اور اگر بالفرض سمجھتے ہیں لوگ ویسے ہی جیسا کہ فرماتے ہیں آپ تو تردید فرمایئے، اس کی فرضیت کی، ملاؤں گا میں بھی آپ کی راگ میں راگ اور ختم کرنے کی کوشش کیجیے ان کاموں کو یعنی کہ اگر بیٹھتی ہے مکھی ناک پر بسبب اپنی گستاخی کے تو اڑا دیجیے مکھی کو اور نہ قطع فرمایئے ناک کو کہ کہے گی اس فعل سے نک کٹا آنجناب کو۔

''عزیزم تم نہیں سمجھ سکتے ان حقائق کو میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ حرف بہ حرف درست ہے، علمائے دیوبند کو بھی ان کاموں سے دشمنی نہیں وہ بھی انہیں جائز اور مستحسن سمجھتے ہیں لیکن ان بے اعتدالیوں کو برا سمجھتے ہیں، مولانا نے بڑے محققانہ انداز میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔

''ہمارے قاسم العلوم والخیرات مولانا قاسم صاحب کا ایک واقعہ میرے قول کی تائید میں شاہدِ عدل ہے۔ حضرت نے ایک مرتبہ طلباء کو کچھ پکاتے دیکھا تو دریافت فرمایا'' کیا پکا رہے ہو'' طلباء نے عرض کیا ''حضور میٹھے چاول پکائے جا رہے ہیں'' حضرت نے فرمایا ''میاں سب لوگ اپنے بزرگوں کی فاتحہ کرتے ہیں اور ہم لوگوں نے کبھی فاتحہ نہیں کی۔ ان چاولوں کو تیار کر کے لاؤ فاتحہ کیا جائے۔

چنانچہ طلباء نے چاول پکا کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا حضرت نے سارے اماموں کے نام فاتحہ کی اور پھر ان چاولوں کو طلباء کے ساتھ تناول فرمایا، اب تم ہی کہو ان

بزرگوں کے نزدیک اگر فاتحہ ناجائز ہوتی تو بھلا یہ فعل کرتے اور اس کھانے کو تناول فرماتے۔

اس واقعہ کو بیان کرتے کرتے مولانا کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

تنبیہ:۔ ناظرین کو مولانا کی اس حقیقت بیانی پر نہیں ہے حق کوئی شبہ کرنے کا اوپر اس بات کے کہ رال ٹپک پڑی نانوتوی صاحب آنجہانی کی دیکھ کر طلباء کے میٹھے چاول اور نکالی تھی اس کے کھانے کی راہ بذریعہ فاتحہ کے کہ تھے حضرت قاسم العلوم والخیرات کے عقیدت مند بسیار مریدین ہزار ہا ہزار اور شاگرد ہر مصرو دیار میں اگر اشارہ کرتے مہاراج تو پکاتے عقیدت مند ہر آئینہ طعام لذیذہ قسم قسم کے مثل طعام مغل بادشاہوں کے فلھذا تسلیم کرنا پڑے گا آپ کو بہر صورت کہ تھی حضرت کی نیت خالص فاتحہ خوانی اور ثواب رسانی کی لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ لہٰذا عرض کیا مولانا سے یا حضرت! میں کیسے تسلیم کروں آپ کی اس دلیل قویہ کو کہ ہے البتہ بغض وعناد از بسکہ بہت زیادہ نانوتوی صاحب کے جانشینوں کو اور برا سمجھتے اور بدعتی جانتے ہیں سب مجھ کو بسبب میری فاتحہ خوانی کے، ''اب تمہیں کون سمجھائے کہہ تو دیا کہ نفسِ فاتحہ کوئی بری چیز نہیں، قیام کوئی ناجائز فعل نہیں بلکہ یہ سب کام جائز و مستحب ہیں، ہاں! اسے ضروری سمجھ لینا ناجائز و حرام ہے۔'' مولانا اکتائے ہوئے لہجے میں بولے۔

عرض کیا فدوی نے کہ ''اے ماہر فن سیاست! اگر ہیں دیوبند والوں کے نزدیک بھی فاتحہ اور قیام اور اسی قبیل کے دوسرے کام مستحب اور باعثِ ثواب اور وہ لوگ واقعی بیزار ہیں محض ہمارے ضروری سمجھ لینے اور فرض و واجب مان لینے کے سبب تو البتہ دعوت دیں آپ کسی بڑے مولانا کو جو حقیقی جانشین ہو حضرت شیخ کا۔ کراتا ہوں میں میلاد درمیان گھر اپنے کے اور دیں فاتحہ اور کریں قیام مولانا آپ کے صرف اور صرف ایک مرتبہ درمیان اس میلاد کے بسبب ہونے مستحب اس کے اور پھر پڑھواؤں میں میلاد دوسرے دن ''مدیر پاسبان'' سے اور نہ کریں قیام اور فاتحہ وہ تا کہ ثابت ہو جائے دونوں کے افعال سے کہ نہیں سمجھتے پاسبان والے ان چیزوں کو فرض یا واجب اور آپ کے علمائے دیوبند نہیں جانتے ان کاموں کو بدعت اور حرام۔ کر لیجیے تاریخ مقرر اور دیجیے دعوت ساتھ اس وعدے کے کہ دیا جائے گا

نذرانہ منھ مانگا۔''

''واقعی بڑی اچھی صورت ہے میں آج ہی دیو بند خط لکھ کر کسی کو بلواؤں گا، کہتے ہوئے مولانا سیٹھ صاحب کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ صبح قیامت تک کسی کو نہیں بلا سکتے ورنہ ڈھول کا پول کھل جائے گا اور ایسا ہوا تو پھر ساڑھے تین روپیہ گز کی کھدر کہاں نصیب ہوگی، توند کیسے بڑھے گی، کار میں بیٹھنا کہاں میسر ہوگا، وہاں تو بس ایک ہی نظریہ ہے۔

مئے بھی ہوٹل میں پیو چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہے شیطان بھی ناراض نہ ہو

0000000000

کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

اے کریم کارساز! بندہ نواز، پروردگار! میرے حال پر رحم فرما کہ ہم ہوا کی کمند میں اسیر ہیں، یعنی کہ میری اسیری ہوائی ہے لیکن اس ہوائی سے یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ ہم اسیر ہو کر ہوا میں معلق ہو گئے ہیں، اور بلند ہوتے ہوتے اس خدائی راکٹ کے ذریعہ ایک دن چاند کی سرزمین پر پہنچ جائیں گے پھر بھارت کی جاسوسی کے جرم میں گرفتار ہو جائیں گے یا مسٹر نکیتا خرشچوف کی کمیونزم کے کل پرزے بن جائیں گے بلکہ ہم ہوا میں گرفتار ہونے کے باوجود دادا آدم کی اس گھسی پٹی اور فرسودہ زمین پر پڑے ہوئے ہیں اور یہ ظالم ہوا جتنی تیز ہوتی ہے بندش اتنی سخت ہو جاتی ہے اور جب چوبائی چلتی ہے تو پھر مت پوچھیے، تحقیق اور ریسرچ کی ایسی ایسی پھلجڑی چھوڑتے ہیں کہ استاد فتو کی سات پشتوں کی افیونی پینک دم سادھ کر سٹک سیتارام ہو جاتی ہے۔

شب برأت کا حلوہ پک کر تیار لیکن فاتحہ سے پہلے ملنا محال، دوپہر تک صبر کی سل سینے پر رکھ کر فاتحہ کے انتظار میں بیٹھے پہلو بدلتے رہے اور جب صبر نہ ہو سکا تو تھوڑا سا حلوہ اٹھا کر زبان پر رکھ لیا، نظر پڑتے ہی ماں نے ڈانٹ پلائی۔

"کمبخت فاتحہ سے پہلے کھاتا ہے زبان ٹیڑھی ہو جائے گی۔" بیوی نے باورچی خانے ہی سے پٹاخہ چھوڑا۔ "کس وہابی کے پلّے اللہ نے باندھ دیا ہے۔" اس پر بھی نہ رہا گیا تو میرے پاس آکر کانوں میں سیسہ پلا گئی "اپنی وہابیت سے باز نہ آئے تو میں چلی۔"

اس آفت ناگہانی سے بچنے کی ایک ہی صورت نظر آئی کہ فوراً مکان سے گیٹ آؤٹ ہو جاؤں۔ باہر نکلا تو مولوی کریم بخش ملتانی المتخلص بہ "آشا سادھی" کے درشن ہو گئے...

''السلام علیکم مولانا!''

''وعلیکم السلام! کہو میاں کہاں چلے؟''

عرض کیا'' آپ کی نیاز کی غرض سے نکلا ہوں اصل میں شب برأت ہے، لوگ مزارات پر جاتے ہیں سوچ رہا ہوں آج میں بھی جاؤں، پہلے تو میں بہت پرہیز کرتا تھا، لیکن جب سے سنا ہے کہ حضرت شیخ اجمیر گئے تھے، میں بھی کبھی کبھی جاتا ہوں لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ فاتحہ کا طریقہ اب تک نہیں آتا، اور اسی لیے آپ کے ہاں جا رہا تھا۔''

''اب یہ مزار وزار کا چکّر چھوڑو، حضرت شیخ کے جانے میں بڑی مصلحتیں تھیں، تم جاؤ گے تو بدعت میں پھنس جاؤ گے!'' مولانا نے نصیحت فرمائی ''قسم ہے جان شیخ کی ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اگر بدعت کی ذرا سی بو بھی آئے تو میرا وظیفہ بند کرا دیجیے گا لیکن ذرا فاتحہ...''

''ابے کیا لگا رکھی ہے آتحے فاتحے کی رٹ!'' مولانا بیزاری کے عالم میں بولے۔

''حضور ذرا بخشنے کا طریقہ...!''

''جو کچھ پڑھو اس کا ثواب دوسرے کو منتقل کر دو بس یہی اصل فاتحہ ہے۔''

''یعنی اس طرح کہوں کہ اس کا ثواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل اور وسیلے سے فلاں کو پہنچے۔''

''ارے نعوذ باللہ! نعوذ باللہ! کیا بات کہہ دی تم نے؟ مولانا نے چونکتے ہوئے کہا۔

انتہائی سادگی سے عرض کیا ''نورنامے'' میں تو ایسا ہی لکھا ہے، ''بحق رسول پاک۔''

''لاحول ولاقوۃ! اب تم جاہلوں کو کون سمجھائے۔ یہ کتابیں نذرِ آتش کر دینے کے قابل ہیں اور یہ غلط اور گمراہ کن عقیدہ مبتدعین ضالین یعنی بریلوی کے سوا اور کسی کا نہیں ہوسکتا، اور پھر اس اہنسا کے دیش میں اتنا بڑا ظلم اور اتیاچار! خدا کی پناہ!''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نبی صاحب کا نام لے کر اور ان کا وسیلہ بنا کر اللہ صاحب پر دباؤ ڈال رہے ہو اور ان کو مجبور کر رہے ہو کہ یہ میرا کام کر دیجیے یعنی یہ ثواب پہنچا دیجیے، یا فلاں مراد پوری کر دیجیے اور اللہ صاحب پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنا سب سے بڑا ظلم ہے جو کھلا ہوا

شرک ہے وہ کسی کا پابند نہیں..."

اس بصیرت افروز تحقیق پر لاجواب سا ہو گیا لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا عرض کیا "قبلہ! وہ جو چچا سعدی فرما گئے ہیں، الٰہی بحق بنی فاطمہ! آخر اس میں بھی تو "بحق" کا لفظ ہے اس کا کیا مطلب"

منہ بنا کر کہنے لگے "یہ شیخ سعدی بھی کوئی آدمی تھے، پکّے رضا خوانی، یہ کیا جانیں شریعت کی باریکیاں اور شرک و توحید کا فرق۔"

"ان لوگوں کے اقوال بالکل قابلِ قبول نہیں، ان کی گلستاں، بوستاں ایک دم فراڈ ہیں اور مہا بکواس، بے سروپا حکایتیں، اس دور میں بھلا یہ لوگ لائق التفات ہیں، یہ زمانہ تحقیق و ریسرچ کا ہے، میاں جو بات بھی کہی جائے گی دلائل و شواہد کی کسوٹی پر پرکھ کر کہی جائے گی، ان کو تو موٹا سا مسئلہ بھی یاد نہ تھا کہ اعتکاف مسجد میں ہوتا ہے یا مزار پر، لکھتے ہیں "و بر مزار یحییٰ معتکف بودم" شیخ سعدی کی سند جاہلوں کے سوا اور کون پیش کر سکتا ہے۔"

علماء کے منہ لگنا بری بات ہے، لہٰذا ہمیں خاموش ہو جانا چاہیے لیکن میں بھی اپنی بریلوی ذہنیت کا مظاہرہ کرنے پر تُل گیا تھا، عرض کیا "حضور! چچا سعدی نے اعتکاف کو مراقبے کے معنیٰ میں استعمال کیا ہے، ان کی کتاب کوئی فقہ کی تو ہے نہیں ویسے اتنی بات ضرور جانتے ہوں گے کہ اعتکاف مزار پر نہیں کیا جاتا، انہوں نے جو لکھا ہے کہ دو دل ایک ہوں تو پہاڑ توڑ ڈالیں، تو کیا اس کا مطلب بعینہٖ یہی ہے کہ کچھ اور ہے، اگر ہے تو یہاں بھی اعتکاف کے معنیٰ مراقبہ سمجھ لیجیے اور پھر جو وسیلے کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے اس کا کیا مطلب؟"

"تقوے کا وسیلہ اور کیا ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"یہ تو ایک موٹی سی بات ہے، اگر کوئی متقی ہے تو اپنے تقوے کو اللہ صاحب کے دربار میں بطور وسیلہ پیش کر سکتا ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ قوم بنی اسرائیل کے تین آدمی کسی غار میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ اچانک غار کا منہ بند ہو گیا۔ تینوں نے اپنے اپنے تقوے کا

وسیلہ بنا کر دعا کہ اے اللہ صاحب...؟

اس نادر تحقیق پر اک دم وجد آ گیا اور درمیان ہی میں بریک لگا دی۔ حضرت سب درست لیکن بقول آپ کے اگر تینوں نے اپنے اپنے عمل صالح کا وسیلہ خدا کی بارگاہ میں پیش کیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان لوگوں نے خدائے تعالیٰ پر دباؤ ڈالا کہ میرے اس تقوے کے بوجھ تلے دب کر خدا کو غار کا منھ کھولنا ہی پڑے گا۔

''بحق عمل صالح اور بحق رسول پاک، آخر دونوں میں کیا فرق ہے؟''

آپ جو جمیعۃ کے صدر کا سفارشی خط لے کر جواہر لال کے پاس کنٹریکٹ کے لیے گئے تو اس کا مطلب بھی یہ ہوا کہ وزیر اعظم آپ کے صدر کی عظمت و جلال کے دباؤ سے مجبور ہو کر آپ کا ٹنڈر منظور کر لیں لہٰذا یہ بھی ظلم!

حضرت عمر نے حضور کے عم محترم کو وسیلہ بنایا وہ بھی ظلم!

حضرات انبیاء نے پیغمبر آخر الزماں کو وسیلہ بنایا وہ بھی ظلم!

سب ظالم، سب بدعتی اور جب سب بدعتی تو خدا کرے کہ میں بھی حقیقی بدعتی رہوں۔

لیکن ملتانی صاحب! ہم بدعتی ہو کر بھی صالحین کے ساتھ رہے اور آپ چھنی پھٹکی توحید لے کر بھی بھاڑ جھونکتے رہے اور بھاڑ جھونکتے جھونکتے بینائی میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی کہ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ جیسا بزرگ بھی جاہل نظر آنے لگا اور کمند ہوا میں گرفتار ہو کر ان کے علم کی پیمائش کرنے یعنی کنویں کا مینڈک سمندر کی وسعتوں کو ناپنے چلا ہے۔

خدا کو چھوڑ کر کانگریس کے آفس کا چکّر، ساری حاجتیں، اسی کی بارگاہ میں وہیں کی بھیک سے شکم پروری، آخر یہ توحید کی کون سی قسم ہے؟

خیر چھوڑیے میری اس بکواس کو آپ موحد ہم بدعتی ہمیں بس فاتحہ کا طریقہ بتایئے!

ہم جیسے سر پھرے بریلوی تو بہر حال جنم جنم کے بریلوی ہیں جو پچھلے جنم میں بھی بریلوی تھے اور اگلے جنم میں بھی بریلوی رہیں گے۔

لہٰذا سات خون معاف، بھینس کے انڈے سے روغن زیتون نکالیں یا بلبل کا بچہ، کوئی

فرق نہیں پڑتا، یعنی قبروں کو سجدہ کریں یا چڑھاوے چڑھائیں، خواجہ باوا کا نام لے کر جہنم کی سیٹ ریزرو کرائیں یا غوث پاک کے نام کا مرغا پال کر مشرک بن جائیں، اور تجدیدِ نکاح کی فکر کریں، سرِ مو فرق نہیں پڑتا، میرے دعوے کی تصدیق میں چچا غالب کا منظوم فتویٰ شاہد ہے۔

اپنے خواجہ کو مناؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
خوب اجمیر کو جاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
یارسول اللہ کہو اور کہو یاشیر خدا
غوث کا نعرہ لگاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
نام شہدا پہ محرم میں پلاؤ شربت
اور کھچڑا بھی پکاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
اور آجائے اگر ماہ ربیع الاوّل
عید میلاد مناؤ تمہیں ڈر کس کا ہے
خواب میں کہہ گئے غالب ہر اک نجدی پر
تیر پر تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے

چنانچہ پچھلے جنم میں بقلم خود دیوبند کے ایک مزار کا مجاور تھا ساری زندگی ان بیبیوں کے نذرانوں پر بسر کی جو اپنے خالص موحد شوہروں کی ہم جنس نوازی کے خلاف احتجاج کرنے آتی تھیں یا ان لوگوں سے کچھ مل جاتا تھا، جو کانگریس کی نگاہِ کرم حاصل کرنے کے لیے رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح آیا کرتے تھے لیکن جب کوئی افلاطونی قسم کا موحد شترمرغ کے پیٹ سے ہاتھی کا بچہ نکالنے کی کوشش کرتا ہے تو مولانا کامل بقلم خود کی عقل دو ہفتے کے لیے یتیم کر کے بھارتیہ کلا مندر میں پہنچ جاتی ہے اور ایک ٹانگ پر کھڑی ہو کر وہ رقص کرتی ہے کہ بھارت ٹیم کے سارے ماہرین پسینے پسینے ہو جاتے ہیں فرمایا ہفت روزہ بانگ حرم کے سنچالک مہاشے نے فرمایا مثل فرمانے افلاطونی موحد کے ساتھ قلب و روح کی گہرائیوں کے۔

''دو ہفتے سے سیرت اشرف کے مطالعہ کی سعادت مجھے نصیب ہے، ہر کتاب پڑھنے کے بعد دل نے کچھ اثرات قبول کیے لیکن روح کی گہرائیوں میں مسرت کی جو لہر اس کتاب کے مطالعے سے زندگی بن کر لہرائی وہ مجھے قرآن حکیم کے بعد اسی کتاب سے ملی...''

شکر کیجیے کہ مسرت کی لہر قرآن کے بعد آئی اگر سیرت اشرف قرآن پر بھی مقدم ہو جاتی تو آپ کیا بگاڑ لیتے۔

اب اگر شتر مرغ کے پیٹ سے ہاتھی کا بچہ برآمد ہونے پر آپ کی عقل بھی داغِ یتیمی کے منصوبے بنا رہی ہے تو صبر کیجیے، ویسے تعزیت کے طور پر مجھے آپ کی یتیمی سے ہمدردی ہوگی اور اگر اس کے باوجود عقل تشریف لے جانا نہیں چاہتی تو امت کے ویدجی سے مرید ہونے کے جرم میں خون کے آنسو روئیے، اور عقل والے سر کو کسی دیوار سے ٹکرا کر چور چور کر دیجیے جس کی سیرت کا مطالعہ سیرت نبوی اور احادیث رسول کے مطالعے سے بے نیاز کر دے اس کا دامن نہ تھامنا زندگی کی وہ یہ بد نصیبی ہے جس کی تلافی نہیں، بہر حال اب بھی وقت نہیں گیا ہے، آپ حضرات سیرت اشرف کی ایک ایک جلد منگا کر مطالعہ کریں، ان شاء اللہ آنکھوں میں کافی نور اور دل میں سرور پیدا ہوگا۔

انصاف و دیانت کا جنازہ نکالنے والو! پہلے اس بات کا اعلان کر دو کہ ہم علم کی منڈی میں بیٹھ کر ڈنڈی ماریں گے، گیہوں دکھا کر جَو بیچیں گے کوئی بھی میری کلائی تھامنے کی کوشش نہ کرے یا زبان و قلم کے سرکش ٹٹو میں ایسی لگام دو جو پیر میاں کی عقیدت میں بھڑک کر انصاف و دیانت کی سڑک نہ چھوڑنے پائے۔ ہم اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کریں، ان کی عظمت کے ترانے گائیں تو تمہارے پیٹ میں مروڑ ہونے لگے، خود ساختہ توحید کے آبگینے چور ہو جائیں۔ ہمیں بدعتی ثابت کرنے میں پھیپھڑے کی ساری طاقت صرف ہو جائے۔ فتوؤں کی وہ بمباری کہ ہیروشیما کی یاد تازہ ہو جائے۔

علم و دیانت کے دعویدارو! اگر ہم نے بقول تمہارے ''سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا بڑھایا کہ رسالت و توحید کا تانا بانا ایک ہو گیا۔'' تو بھی تم سے اچھے رہے کہ جو کچھ بڑھایا اللہ

کے رسول کو بڑھایا، اس کی عظمت کے گیت گائے، جس کی عظمت کے مقابلے میں پوری کائنات ہیچ ہے، لیکن تم نے کمپیٹیشن میں یہ حماقت کرلی کہ سارے بزرگوں کی عظمت کو بالائے طاق رکھ کر تھانوی جی کی سیرت کو قرآن کے بعد درجہ دے دیا اگر تمہارے یہاں دیانت نام کی کوئی شئے ہے تو خدارا بتاؤ کہ شخصیت پرستی کے اس جدید جنم کے بعد احادیث نبوی، سیرت صحابہ اور امت کے فرزندانِ جلیل کی تاریخ کا کیا حشر ہوگا۔ تھانوی جی کی سیرت کے آگے سیرت رسول کی اتنی کھلی تنقیص عقیدت مندی کا اتنا بھیانک انکشاف توحید کی کس قسم میں داخل ہے۔

ظالمو! یومِ حساب بہت قریب ہے، دیکھنا ہے کہ قبر سے حشر تک کی ہولناک منزلوں میں تھانوی جی کی اندھی عقیدت تمہارے کام آتی ہے۔ یا سرکار دو عالم ﷺ کی تعظیم ہم بدعتیوں کے۔

اللہ رے خود ساختہ توحید کا نیرنگ
جو بات کہیں فخر وہی بات کہیں ننگ

لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اس خودساختہ توحید کے حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔ توحید کی عینک تو صرف ہم بدعتیوں کو دیکھنے کے لیے لگائی جاتی ہے۔ شخصیت پرستی اور عقیدت مندی کی دھن میں خود جو چاہیں کہیں شیخ جی کی عقیدت نے زور مارا تو انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقتدا بنادیا۔ دادے میاں کی عقیدت نے جوش مارا تو فرمایا گیا ''ابوحنیفۃ الدوراں۔''

''ابوحنیفۃ الدوراں کی گل افشانی کسی بدھو، خیراتی مجسم عقیدت مند نے نہیں کی بلکہ شیخ الزمین والآسمان کے قلم گوہر کی کرشمہ سازی ہے۔ وہ جس کی دیانت وتقویٰ کا یہ عالم کہ جب بریلی کا مردِ حق آگاہ علمائے حرمین سے ان کے اکابر کے گھناؤنے عقائد کے متعلق فتاوے دریافت کررہا تھا تو شیخ جی دم سادھے سنک سیتارام بنے رہے، کسی کے کہنے کی جرأت وتوفیق نہ ہوئی کہ یہ فتاوے غلط بنیاد پر پوچھے جارہے ہیں اور جب ہندوستان میں خودساختہ توحید کے پردے چاک ہونے لگے اور علمائے حرمین کے فتوؤں کے آئینے میں ان کی گندی صورتیں عوام کے سامنے آنے لگیں تو شیخ جی کی انصاف پسند طبیعت نے انگڑائی لی اور آپ

نے ان کے انتقال کے بعد پیچھے سے حقیقت کا بگل بجانا شروع کیا۔ چچا سعدی علیہ الرحمہ نے آپ ہی کی شان میں کہا ہے۔

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتے بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتے بھی نہیں

اور ''حنیفۃ الدوراں''، وہ ذاتِ گرامی ہیں جن کی روٹی کوّا لے گیا تھا اور بیوی کی شکایت پر نہ صرف کوّا کھانا جائز کیا بلکہ عین ثواب کی میخ ٹھونک دی دو چار ابوحنیفہ ایسے ہی پیدا ہو گئے تو فقہ کا دیوالہ نکلتے دیر نہیں لگے گی۔

❀❀❀

چل مرے خامے.........!

فرمایا مدیرِ استقامت مولانا ظہیر الدین نے فرمانا بہ ایں طور کہ گویا اس مجرم و خطا کار کو اپنے نام کی پاداش میں دے دیں گے پھانسی اگر باز نہیں آیا میں اپنی ضد سے۔ کہا کہ ہے نام تمہارا کنڈم اجنبی اور غیر مانوس واسطے ناظرین استقامت کے اس لیے ھیھات نہیں شائع ہوگا مضمون تمہارا بیچ ڈائجسٹ میرے کے۔ عرض کیا عاجز و خاکسار نے قبلہ و کعبہ ہر آئینہ کہ ہیں آپ میرے لیے لائق تکریم لیکن نہیں بنا سکتا آپ کو حکم یا جج واسطے فیصلے اپنے مقدمہ کے۔ اگر اتفاق کریں آپ تو فیصلے کا اختیار دوں میں اپنے معزز قارئین کو جیسا کہ حق ہے اختیار دینے کا۔ پس اگر کنڈم کر دیویں یہ پنچ صاحبان نام اس عاجز و خاکسار کا تو ہر آئینہ نہیں چھپے گا مضمون میرا۔ اور اگر فیصلہ ہو جائے میرے حق میں تو شائع کرنا ہوگا میرے مضمون کو ساتھ اپنی پوری شگفتہ خاطری کے۔

اس لیے میرے اجنبی غیر مانوس یا بہ الفاظِ دیگر جدید اسٹائل کے اس نام پر آپ کو حیرت و تعجب ہو یا نفرت کا کوئی جذبہ بیدار ہو تو خدارا اظہارِ بیزاری سے پہلے آپ یہ سن لیجیے کہ زمانہ چونکہ ترقی پسندی، جدیدیت اور ماڈرنائزیشن کا علم بردار ہو چکا ہے اس لیے کسی قدیم انداز کو جدیدیت کا لباس پہنایا جا سکتا ہے۔ یوں بھی جمہوریت میں آزادیٔ ذہن و فکر کی ہر طرح چھوٹ ہے اس لیے مولانا ظہیر الدین کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ میرے اس ماڈرن نام پر قدامت پسند ناک کو چڑھنے کی اجازت دیں ترقی، تلاش، جستجو اور جدت کے اس دور میں اگر امریکہ و روس نئی دنیا کی تلاش کر سکتے ہیں۔ اور چندا ماما کے روایاتی طلسمات کا پردہ فاش کر کے اسے مٹی اور چٹانوں کا بنجر علاقہ ثابت کر سکتے ہیں تو کیا ہم ہندوستانی اتنے گئے

گزرے ہیں کہ دو چار جدید نام بھی تخلیق نہ کر سکیں؟ جدیدیت کی پیہم و مسلسل پیداوار سے اگر اس بات کا خطرہ ہے کہ شرح پیدائش کا اندھا دھند اضافہ مسمیٰ کا قحط پیدا کر دے گا اور ناموں کو نشو ونما کا بھرپور موقعہ میسر نہ آئے گا تو بسم اللہ برتھ کنٹرول کے سارے اصول ضابطے اور اس کی تمام دفعات کو اسیر بھی لگا دیجیے؟۔ لیکن اس احتیاط کے بعد بھی کم از کم تین ناموں کی تخلیق کی اجازت تو دینا ہی ہوگا۔ جب کہ میں صرف ایک ہی نام کا جنم داتا ہوں۔

اگر مدیرِ استقامت کے رعب وجلال نے آپ کے ذہن وفکر کو مرعوب نہیں کیا ہے تو خدارا انصاف کیجیے کہ ترقی پسندی اور جدیدیت کے نعرۂ مستانہ سے مدہوش وسرشار ادیب و شاعر جب مسلمہ محاورات کے ساتھ فری اسٹائل کر سکتے ہیں۔ اور خوشی کے برگد، غموں کے تاڑ، احساسات کے جنگل، جذبات کے میدان، ارمانوں کی گلاب جامن، امیدوں کی بالو شاہی، تمناؤں کے ٹماٹر اور مایوسیوں کی گوبھی جیسے نادر الوجود محاورات کو جنم دے کر اردو بانو کے اہل وعیال میں کثرت واضافہ کر کے احسان کر سکتے ہیں تو پھر اس خاکسار ہیچمدان کے صرف ایک نام پر اتنی قیامت کیوں؟ نئے محاورات اور جدید اصطلاحات کے سلسلے میں معتبر اطلاعات تو یہ ہیں کہ ان نیل باٹم محاورات کو سن کر غالب نے شاعری چھوڑ کر گھاس کھودنی شروع کر دی ہے اور میر تقی میر تیل مالش کا سرگم بجاتے نظر آتے ہیں۔

آپ کہیں گے یہ سب شعر وادب کی باتیں ہیں فن کے نکات اور اس کی باریکیوں سے ہمیں کیا لینا دینا۔ یہ ان کا اپنا اندازِ فکر ہے جو چاہیں کریں ہم کون ہوتے ہیں دخل در معقولات کرنے والے۔ میں عرض کروں گا کہ جدت پسندی اور ترقی کی یہ سنک صرف شاعروں ہی کی دنیا تک محدود نہیں بلکہ جدت پسندی کا یہ متعدی مرض خیر سے اب تو استاد جمعراتی اور مرزا گھسیٹن کے گھروں میں بھی اپنا قدم پورے طور پر جما چکا ہے۔ میرے پڑوس کے استاد گھسیٹا نے اپنے پوتے کا نام مہتاب اختر۔ اور میر جمن نے اپنے چھوٹے لڑکے کا نام مقدر بخت رکھا ہے اور تو اور بوا بتولن کے یہاں پوتی ہوئی تو اس کا نام ثریا انجم شبراتن نے اپنی بھانجی فقیرن کا نام بدل کے ضاحکہ تبسم رکھا۔ اور تو اور خالہ نصیبن کی لڑکی کے گھر بچی تولد

ہوئی تو بچی کا نام نصیبہ خاور پڑا۔ ناموں کی تفصیل میں تو پتا نہیں کتنے صفحات سیاہ ہو جائیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جدت وقدامت کی حس اتنی بیدار ہو چکی ہے کہ عبد القادر، عبد الکریم، فاطمہ، ہاجرہ، مریم جیسے نام کے لیے اب معاشرے میں کوئی جگہ نہیں۔ جدھر دیکھیے جدت کی شہزادی اپنی حکمرانی کرتی نظر آرہی ہے۔

جذبہ شوق کی سرحد اگر یہاں بھی نظر آتی تو صبر وضبط سے کام لینا ممکن تھا لیکن خوردبین لگا کر دیکھنے کے باوجود اس کی حدوں کا دور دور تک پتا نہیں ملتا۔ طلعت جمال، عشرت نہال جیسے خالص مؤنث ناموں کو صاحبزادوں سے چپکا دیا گیا۔ اور آفتاب جہاں، مہتاب بانو جیسے مذکر ناموں کو صاحبزادیوں کے حصے میں دے دیا گیا۔ لباس، چال، ڈھال اور زلفوں کا تبادلہ ہوا تو پھر ناموں کا تبادلہ کیوں نہ ہوتا۔

اور اخیر میں یہ بھی سن لیجیے کہ ناموں کی جدت طرازیوں میں اپٹوڈیٹ اور فیشن ایبل طبقے نے اگر نئی نئی اصطلاحات، نئے نئے نام، نئی نئی ترکیبیں ایجاد کر کے حیرت انگیز اور محیر العقول انقلاب برپا کیا ہے تو ہمارے مولوی، صوفی اور تسبیح ومصلے والے بزرگوں نے بھی کچھ کم پیش قدمی نہیں کی۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ اپٹوڈیٹ حضرات کی تجدید پسندی اپنے ماحول ومزاج کے اعتبار سے ہے اور بزرگانِ باصفا کی ندرت آفرینی اپنے اعتبار سے۔

ہم جیسے دنیاداروں کو اللہ والوں کے حال احوال اور مزاج وطبیعت کی اندرونی تہہ کا پتا بھی نہیں چلتا، ہم تو بس ''چلت پھرت'' دیکھ کر اسیرِ دام، شامتِ اعمال ہو جاتے ہیں۔ وہ تو کرم نوازی ہے مولانا چشمک علی رشیدی کی جنھوں نے اس عاجز وگنہگار کو بھی اپنی نصیحتوں کے طفیل ایک چلّہ دینے پر آمادہ کر لیا۔ اور جب عجائب خانے کی یہ مخلوق امیر الامراء یعنی حضرت جی کے حکم سے ستو اور چنے کے تھیلوں کے ساتھ پابہ رکاب ہوئی تو ہماری جماعت کے امیر نے کچھ اس طرح فرمایا۔

بھائیو! ہم لوگ اللہ ورسول کے کام کے لیے اور دین کی تبلیغ کے لیے نکلنے والے ہیں

ضروری ہے کہ جماعت کے لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں۔ اور پھر تعارف کراتے ہوئے فرمایا، یہ جو ہمارے بغل میں ہیں ان کا نام صوفی گلقند قاسمی ہے۔ مول گنج کے چوراہے پر ریوڑیاں بیچا کرتے تھے۔ بھوپال سے آئی ہوئی جماعت سے اتنا متاثر ہوئے کہ ڈگرا وہیں پٹکا اور جماعت میں شامل ہو گئے۔ جب سے اب تک آٹھ ماہ ہوئے بیوی بچوں کا منھ تک نہ دیکھا۔ بس چلّے پر چلّہ دیئے جا رہے ہیں۔ اور ان کے متصل مرزا تخلخل رحمانی ہیں یہ ان کا دوسرا چلّہ ہے۔ اور ان کے بغل میں ملّا جریان الذنوب خلیلی ہیں۔ میرے بائیں طرف کو سترہ سال کے یہ غلمان الجماعت ہیں۔ اپنی کم سنی کی وجہ سے اگرچہ چند ہی چلّے دیئے ہیں لیکن قلب کی حالت اتنی بہتر ہے کہ اکثر اوقات میں ان سے روحانیت کشید کرتا ہوں۔ اور یہ سامنے والے بھائی تنور الحق ہیں اٹاوہ میں ان کی مونگ پھلی کی آڑھت ہے۔

ماہنامہ استقامت فروری ۱۹۷۹ء

(ہمزاد اجتماعی)

چل مرے خامے........!

محترم ایڈیٹر صاحب:

کل کی ڈاک میں کرم نامے کے ساتھ ہی سوالات کا وہ فورم بھی ملا جس کی خانہ پری کے لیے آپ نے فرمائش کی ہے دوبدو میں آپ کو انٹرویو نہیں دے سکتا تو آپ نے یہ صورت نکالی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے انٹرویو کی ضرورت آپ کو کیوں پیش آئی۔ ایک ایسالا اُبالی انسان جو زندگی کے رکھ رکھاؤ سے دور ہو جس کے جاننے والوں کا حلقہ ممبئی کی چالیوں اور کلکتہ کی باڑیوں سے زیادہ تنگ ہو۔ جس کی صلاحیتیں کانگریسی عہد کے بھوت پرو منتریوں سے بھی کم درجے کی ہوں۔ جس کی معلومات جنتا کے منتروں سے بھی گئی گزری ہوں جو ذاتی عداوتوں کی خاطر غلط سیاست کی قربان گاہ پر قوم کو بھینٹ چڑھانے کا جذبہ نہ رکھتا ہو۔ جوان آنسوؤں کی اہمیت سے ناواقف ہو جو صرف اور صرف منسٹری ملنے سے قبل تک بہایا جاتا ہو۔ جو آر ایس ایس کو دودھ کا دھلا ہوا تو کیا گنگا جل سے نہایا ہوا بھی نہیں سمجھتا ہو۔ جو پیشاب جیسی نجاست کو آبِ حیات تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو، جو منسٹری اور لیڈری کے فرق کو بھی پورے طور پر نہ جانتا ہو اس کا انٹرویو شائع کر کے آپ کیا کریں گے؟

جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے اس کے قبل بھی آپ انٹرویو کے لیے تقاضہ کر چکے ہیں۔ ویسے اس یادداشت نے بھی عرصے سے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ صبح سویرے بیگم کی فرمائش کے عین مطابق سبزی ترکاری کی فراہمی یادداشت کے ذمے تھی گوبھی کی جگہ امرود اور آلو کی جگہ خربوزہ آجائے تو یادداشت بیچاری کو صلوات سُننی پڑے دفتر جانے سے پہلے کسی نہ کسی بچے کی فرمائش پپّو کی ٹافی کی ضد، گڈو کی چپل کی فرمائش، منّی کی گڑیا کی فراک

میں لگانے والی ہیر پن کی تاکید۔ فرمائشوں کا تسلسل جب ٹوٹنے پر نہ آئے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یادداشت کہاں تک ساتھ دے گی پھر غریب کی یادداشت تو اور زیادہ چڑچڑی اور نازک مزاج ہوتی ہے۔ تنگ آکر ایک دن ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے گئی۔ اس لیے صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا کہ انٹرویو کا تقاضہ آپ نے کتنی بار کیا ہے۔

سب سے پہلے آپ نے اس وقت انٹرویو کے لیے کہا تھا۔ جب مول گنج چوراہے پر بنارسی داس پنواڑی کی دکان پر میں پان کھا رہا تھا۔ اور آپ نے پیچھے سے ایک دم روستان کی سلیوٹ ماری۔ رسمی علیک سلیک کے بعد پیسہ نہ ہوتے ہوئے بھی آپ کے لیے پان کا آرڈر دے دیا وہ تو خدا آپ کا بھلا کرے کہ پان کے پیسے آپ نے چکا دیئے اور آبرو اپنا بھرم کھونے سے بال بال بچ گئی۔ پھر آپ نے بڑی اپنائیت کے انداز میں کہا تھا میں آپ کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔ جی تو چاہا کہ آپ کی اس اپنائیت پر اسی وقت قربان ہو جاؤں لیکن جس عظیم شہر کے چوراہے پر ہر قدم قربان ہونے والوں کی بھیڑ لگی ہو۔ جمی پہلوان سے لے کر بھولا ناتھ تک، استاد جمن کے لونڈے شبن سے لے کر میر گھسیٹا تک ہر شخص قربان ہونے کے حوصلے کے ساتھ گھوما پھیری کر رہا ہو۔ وہاں مجھ جیسے قربان ہونے والے کو کوئی دیکھنے والا بھی نہ ملتا اس لیے یہ کہہ کر چلتا بنا کہ ابھی تو سہارن پور سے پیر و مرشد آنے والے ہیں اور نیاز مند حضرت جی کے استقبال کو جا رہا ہے اس لیے پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ آپ اس جواب پر پچاس پیسوں کے خونِ ناحق پر ماتم کرتے رہے اور ناچیز یہ جا وہ جا بھیڑ میں گم ہو گیا۔

دوسری بار بمبئی کی چوپاٹی پر آپ کی سلاما لیکم نے سارا موڈ خراب کر دیا تھا جب میں بھیل پوری کی چاٹ کھا کر بیئر اور وہسکی کا نشہ کشید کر رہا تھا۔

بھیل پوری اور چوپاٹی، چوپاٹی اور بھیل پوری کس قدر جذباتی ہم آہنگی اور کس درجہ شاعرانہ مناسبت ہے دونوں کے درمیان۔ یہ بھی چند چیزوں کا مجموعہ، چوپاٹی بھی حسن کی چند قسموں کا مرکب۔ یہاں بھی خواہش اور چاٹ وہاں بھی تشنگی اور پیاس۔ وہاں بھی گاہکوں کو متوجہ کرنے کی قسم قسم کی صدا وہاں بھی خریداروں کے لیے قیامت کی سیکڑوں ادا۔ یہاں بھی

خرید و فروخت وہاں بھی تجارت اور بیوپار۔ بھیل پوری کے بغیر چوپاٹی بیکار اور بغیر چوپاٹی کے بھیل پوری بے مزہ۔ پھر شام کا وقت جب فطرت کا جمال اپنی تمامتر رعنائیوں اور جلوہ طرازیوں کے ساتھ بے نقاب ہوتا ہے تو سمندر کا پانی بے نقاب، موجوں کی اٹکھیلیاں بے نقاب، شام کی کجلاہٹ بے نقاب، جلوؤں کی ان بے حجابیوں کے درمیان اگر آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں نقاب میں ہوتیں تو مظاہرِ فطرت پر بڑا ظلم ہوتا اور بمبئی کے خمیر میں چونکہ ظلم و زیادتی کا کوئی عنصر شامل نہیں اس لیے بے حجاب ماحول میں جو بھی آتا ہے سرتاسر بے حجاب ہوکر آتا ہے۔ ادا بے حجاب، وجود بے حجاب، ذہن اور فکر بے حجاب، قدم قدم بے حجاب، نظر نظر بے حجاب، نفس نفس بے حجاب، والدین کی بزرگی بے حجاب، اولاد کی سعادت مندی بے حجاب، بچوں کا شعور بے حجاب، بڑوں کا تجربہ بے حجاب، آپ تلاش کریں تو چوپاٹی پر ہر چیز ملے گی لیکن حجاب دور دور تک کہیں نظر نہ آئے گا۔ بنت حوا کے دوپٹے میں (خیر سے جس کا وجود بھی اب قریب الختم ہے) ابن آدم کی شرٹ میں سٹے کا نمبر بتانے والے باوا کی اگربتیوں کے دھوئیں میں۔ طوطے کی چونچ کے سہارے قسمت کا حال بتانے والے جیوتشی کے پنجرے میں، فادر کی ٹائی میں، دستور کی ٹوپی میں چوپاٹی پر کہیں حجاب نظر نہیں آتا ہاں اگر سمندر کو غور سے دیکھیے تو کچھ مردہ کچھ دم توڑتے کچھ ڈوبتے اور کچھ بہتے ہوئے حجابوں کی لاش ضرور نظر آئے گی۔

پھر اس بے حجاب ماحول میں بھیل پوری؟ بس یہ نہ پوچھیے کہ کیسی نشہ آور ہے۔

اب بھی یاد ہے کہ آپ کے سلاما لیکم کے لیموں کی ترشی سے سارا نشہ ہی پھٹ کر رہ گیا تھا۔ علیک سلیک خیریت و عافیت کے بعد آپ نے پھر اسی کمبخت انٹرویو کی بات شروع کردی۔ آپ کا انٹرویو بہت ضروری ہے، آپ سے ملاقات ہوگئی ہے، بغیر انٹرویو لیے نہیں چھوڑوں گا۔ اور میں نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے عرض کیا تھا کہ اگر انٹرویو ہی ضروری ہے تو بمبئی میں ان عربوں سے انٹرویو لیجیے جن کے سروں پر اسرائیلی جارحیت کی ننگی تلوار لٹک رہی ہے۔ اور بے نیازوں کی یہ جماعت تاج محل ہوٹل او برائے کی معطر راتوں میں زندگی کا بھرپور ثبوت پیش کر کے روایتی اولوالعزمی اور بہادری کے ساتھ؟؟ کا مذاق اڑانے میں مصروف

ہے۔ جو بے اندازہ تیل اور سونے کی دولت کو عسکری طاقتوں کے حصول پہ صرف کرنے کی بجائے کاکل ورخسار کی خریداری پر صرف کررہے ہیں اسرائیلی طاقت شیطانوں کو انگوٹھا دکھا رہی ہے؟۔ جن کی سخاوت اور شرافت دیکھ کر آج پوری بمبئی محو حیرت ہے۔

یا پھر ان علمائے صادقین سے انٹرویو لیجیے جو تمام بے اعتدالیوں، بد اعمالیوں اور بد عقیدگیوں کے باوجود عربوں کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کا قلابہ ملانا اور ان کی قصیدہ خوانی کرنا، صرف اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس قصیدۂ مدحیہ کی مناسب اجرت اور معقول قیمت ملتی ہے۔

اور میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا تھا جناب بھائی ظہیر الدین صاحب! اگر آپ بھی اپنے ذہن کے پرانے اور فرسودہ ڈھانچے کو تبدیل کرلیں اور چڑھتے ہوئے سورج کی سلامی کو اپنا مسلک و مزاج بنا کر سلاطین و شیوخ کی قصیدہ خوانی شروع کردیں تو آپ کے جسم پر معمولی قسم کے کپڑے کی بجائے قیمتی سے قیمتی جاپانی کپڑے کی شیروانی نظر آئے۔ سنّی بڑی مسجد مدنپورہ کی کھردری چٹائی پر رات بسر کرنے کی بجائے تاج محل میں نہیں تو دہلی دربار میں ضرور قیام ہوتا۔ دروازے پر امپالا تو نہیں البتہ فئٹ یا ایمبسڈر ضرور کھڑی ہوتی۔ غیر ممالک کے سفر کرتے۔ حکمرانوں سے ملاقاتیں ہوتیں اور عیش و عشرت کے وہ تمام سامان میسر ہوتے جس کے لیے ایک انسان اس دنیا میں تمنا کرسکتا ہے۔

اور آپ نے میری بات (جسے شاید آپ بکواس ہی سمجھ رہے تھے) کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

بھئی! بیجا خوشامدوں اور غلط قصیدہ خوانی کے لیے میں تیار نہیں۔ نہ ضمیر فروشی میرا مزاج ہے نہ سرمائے کی قربان گاہ پر حقیقت کو بھینٹ چڑھانا میرا مسلک۔ یہ صحیح ہے کہ اس طرح مادی فائدہ ہوگا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ضمیر ہمیشہ کے لیے مرجائے گا۔ اور ضمیر کی زندگی کروڑوں کی دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔

اور ضمیر کی اس فرسودہ اور قدیم تعریف و تشریح پر احتجاج کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا۔

جناب! جس ضمیر کی آپ بات کررہے ہیں وہ ماضی کا ضمیر تھا جو عرصہ ہوا آؤٹ آف ڈیٹ

ہو چکا ہے۔ آج کی دنیا میں اس چھوٹے موٹے ضمیر کے لیے کوئی جگہ نہیں جو ہاتھ لگاتے ہی مرجھا جائے۔ آج کا ضمیر توانا وصحت مند ہی نہیں بلکہ بڑا سخت جان اور آل پروف ہے۔ سائنسی ضمیر میں ایسے اجزائے ترکیبی شامل کیے گئے ہیں کہ مرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جبل پور کے فسادات کے متصل بعد قسم کھانے والے خانۂ کعبہ کا غلاف تھام کر قسم کھاتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان ہر طرح خیر وعافیت کے ساتھ ہیں ان کی جان، مال، عزت وآبرو سب محفوظ ہے اور ضمیر مردہ نہیں ہوتا۔ لینے والے، آر ایس ایس کی مذہبی تقریبات کا پرشاد لیتے ہیں اور ضمیر کو موت نہیں آتی۔ چڑھانے والے سمادھیوں پر پھولوں کی مالا چڑھاتے ہیں اور ضمیر پر نزع طاری نہیں ہوتی۔ لینے والے جگت گرو کے چرنوں میں پہنچ کر آشرواد حاصل کرتے ہیں اور ضمیر زندہ رہتا ہے۔ بننے والے پرسنل لاء کا نام لے کر ایم ایل سی بنتے ہیں اور ضمیر کی زندگی میں فرق نہیں آتا۔ سیاسی اختلافات کی قربان گاہ پر قوم کو بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے اور ضمیر کو موت تو کیا آئے گی معمولی قسم کا زکام بھی نہیں ہوتا۔

میں تسلسل کے ساتھ بولے جا رہا تھا اور آپ کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اس کرب و اذیت کی غمازی کر رہا تھا جو روایاتی نازک مزاج ضمیر کا مخصوص حق وحصہ ہے۔

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی؟

ماہنامہ استقامت مارچ ۱۹۷۹ء
(ہمزاد اجتماعی)

پاسبانِ ملّت علّامہ مشتاق احمد نظامی

آخرش یہ ہوا کہ پاسبان کا دوسرا نام ''نجد سے سہارن پور تک'' پڑ گیا جس نے ایک بار پڑھ لیا ماہ بماہ بغیر پڑھے اسے چین نہیں۔ نجد سے سہارن پور تک سنجیدہ مزاح اور علمی و معلوماتی ظرافتوں کا حقیقت پسندانہ نچوڑ ہے۔ مولانا کامل اپنے اس طرزِ نگارش میں بالکل یگانہ ومنفرد ہیں۔ بات میں بات پیدا کرنا اور ہنستے بولتے ایسی دوررس باتیں کہہ جانا، جہاں خواص ہی کا ذہن جا سکے یہ ان کا خاص فن ہے یہ ایک خداداد صلاحیت ہے جس نے انہیں دوسروں سے ممتاز کر دیا ہے۔

مولانا کامل۔ ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ ہیں! اپنے وقت کے بحر العلوم شیخِ طریقت حضرت مولانا فرخند علی علیہ الرحمۃ والرضوان کے خلف سعید ہیں جن کی علمی خدمات سے صوبۂ بہار آج بھی سدا بہار ہے۔ گوشے گوشے میں آپ کے تلامذہ ملک کی معیاری درسگاہوں میں مسندِ تدریس پر فائز ہیں۔

مدتوں سے قارئین پاسبان کی خواہش تھی کہ انہیں ایک جگہ جمع کر دیا جائے، آج ان کی خواہش کے مطابق ''نجد سے سہارن پور تک'' کا مجموعہ ان کی خدمت میں حاضر ہے۔

ربّ کریم مولانا کامل کو سلامت رکھے تا کہ وہ مدتوں خود بھی ہنستے رہیں اور دوسروں کو ہنساتے رہیں۔

آج کی دنیا میں ایسے لوگ بہت ہی کم یاب ہیں، غم بانٹنے والے بہت ہیں، مگر خو... دینے والے نہیں، البتہ مولانا کامل اس سے مستثنیٰ ہیں۔ خدائے قدیر اس مجموعے... شرفِ قبول سے نوازے، آمین بجاہ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

RAZA DARUL MUTALA'A
Pukhrera, Sitamarhi, Bihar